# اوہام وخرافات کا خاتمہ

## محوالموھوم کا اُردو ترجمہ

مولف: آیت اللہ العظمی غلام قلی شریعت سنگلجی

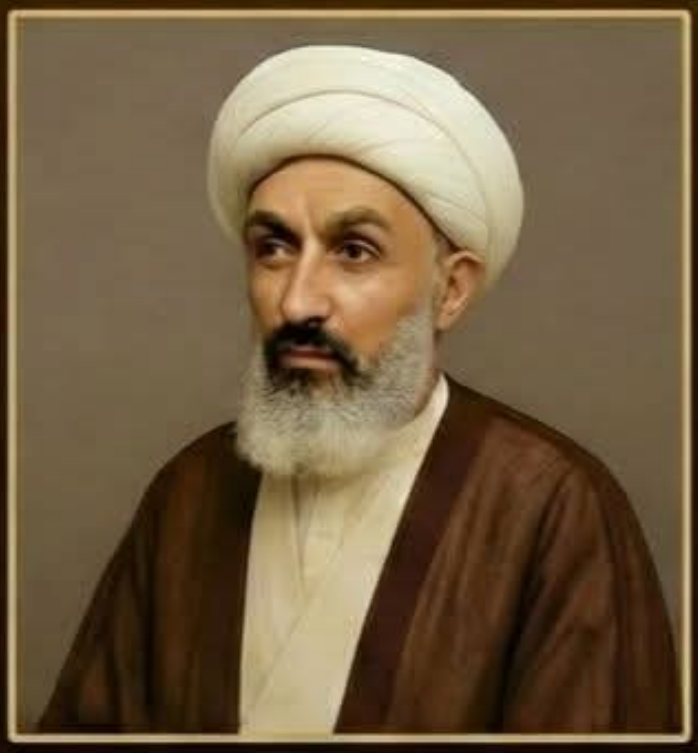

وجدان پبلشرز

# فہرستِ مضامین


تمہید۔۔۔۔۔۔13

مقدمہ۔۔۔۔۔18

تمام انبیاء ورسل کی وفات پر قرآن سے استدلال۔۔19

خضر اور الیاس کی موت پر خاص دلائل۔۔33

خضر اور الیاس کی موت پر عقلی دلائل۔۔36

حضرت عیسی کی وفات پر قرآنی دلائل۔۔39

قرآن مجید میں لفظ توفی۔۔41

حدیث میں توفی۔۔۔44

لغت میں توفی۔۔46

قرآن مجید میں لفظ رفع۔۔۔۔ 48

حدیث میں رفع۔۔۔۔ 50

لغت میں رفع۔۔ 52

نتیجہ۔۔۔۔۔54

مفسرین کا اختلاف۔55

حضرت عیسی کی موت کی طرف اشارہ کرنے والی آیات۔۔67

مسیح کی وفات پر دلالت کرنے والی آیات۔۔72

مسیح کے زندہ ہونے کے لیے استدلال کی جانے والی آیات۔۔۔79

# مقدمہ

بزرگ انسانوں کی بقا کی سب سے بڑی ضمانت اور ان کا سب سے سچا تعارف ان کے آثار ہوتے ہیں۔ جب کسی عظیم شخصیت کے مفید اور نمایاں آثار موجود ہوں تو نہ اسے مردہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے اوصاف و فضائل بیان کرنے کی کوئی خاص حاجت رہتی ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو ارسطو، بو علی، مولوی، فردوسی اور سعدی یا «واٹ» اور «ایڈیسن» کو اچھی طرح جانتے ہیں، یعنی ان کے آثار سے واقف ہیں، مگر شاید سو میں سے ایک بھی ایسا نہ ہو جو یہ جانتا ہو کہ یہ بزرگ شخصیات کب اور کہاں پیدا ہوئیں، کس طرح زندگی گزاری، اور کس وقت اور کس انداز سے انہوں نے زندگی کو الوداع کہا۔

اس حقیقت کے اعتراف کے باوجود، میں خود کو دو وجوہ سے اس امر کا پابند سمجھتا ہوں کہ اس رسالے کے آغاز میں بطورِ مقدمہ اس کے جلیل القدر مؤلف کی زندگی، فضائل اور آثار کا مختصر تذکرہ قلم بند کروں۔ ایک وجہ یہ ہے کہ معزز احباب نے اصرار کے ساتھ مجھ سے یہ ذمہ داری ادا کرنے کی درخواست کی اور مجھے اس کا مکلف ٹھہرایا؛ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ میرے محترم استاد، مرحوم شریعت سنگلجی—جو اس رسالے اور دیگر رسائل و کتب کے مصنف ہیں—کا مجھ پر تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ایک عظیم حق ہے۔ اس معنوی حق کی عظمت اس قدر ہے کہ اگر میں

زندگی بھر بھی ان کے فضائل بیان کرتا رہوں اور انہیں قلم بند کرتا رہوں، تب بھی اس حق کی ادائیگی سے عہدہ برآ نہ ہو سکوں گا۔جب مجھے اس مقدمے کی تحریر کی ذمہ داری سونپی گئی تو میں نے مطبوعہ صفحاتِ «محوُ الموہوم» کا ایک سرسری مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کے دوران ایک مرتبہ پھر دل ہی دل میں اس بزرگوار استاد کی جرأت، صاف گوئی، علمی احاطے اور گہری آگاہی پر داد دی۔ میرے نزدیک ایک عظیم عالم کے لیے سب سے اعلیٰ صفات اور فضائل یہ ہیں کہ وہ علم و احاطہ بھی رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ جرأت و صراحتِ بیان بھی—

اور اپنے علم کے باب میں ثابت قدمی اور پشتکار بھی—کہ مجموعی طور پر ان تمام اوصاف کو «عمل» کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ دنیا میں محض «جاننے» کے معنی میں علم بکثرت پایا جاتا ہے، اور میرے خیال میں ایسے علم کی کوئی خاص قدر و قیمت نہیں۔ جو چیز نہایت کمیاب اور بے حد قیمتی ہے وہ علم پر عمل ہے؛ یعنی وہ علم جو «کر گزرنے» کی صلاحیت کے ساتھ ہو۔ یہ بہت مشکل ہے کہ انسان کسی بات کو جانے، پھر اپنے جانے ہوئے کو یقین اور ایمان کے درجے تک پہنچائے، اور اس کے اظہار، اس پر عمل اور اس کی تبلیغ کے لیے ہمت اور جرأت بھی رکھتا ہو۔

نہ صرف ہمارے معاشرے میں بلکہ تمام انسانی معاشروں میں آج بھی حقیقی علم پر حقیقی جہالت غالب ہے، اور علم و فضیلت کی ہر چنگاری کو

جہالت اور تاریکی سے بھرے ہوئے بے کنار و خشک فضاؤں کا سامنا رہتا ہے۔ علم کا چراغ آہستہ آہستہ جلتا ہے اور روشنی پھیلاتا ہے، مگر جہالت اور نادانی کی تاریکیوں میں ہولناک طوفان اٹھتے ہیں جو اس نور کو بجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہت سے ایسے چراغ بھی ہوتے ہیں جو شدید اور سیاہ طوفانوں کے خوف سے اپنے حسن کو چھپا لیتے ہیں، تاریکی کی لہروں کے حملوں سے بچ نکلتے ہیں، سلامتی کا دامن تھام لیتے ہیں اور جہالت کے شور و غوغا سے بے پروا ہو جاتے ہیں؛ اگر وہ اہلِ یقین ہوں تو صرف اپنے اندر ہی روشنی پیدا کرتے ہیں، اور اگر شک کی منزل سے آگے نہ بڑھے ہوں تو وہ مدھم اور بے ثمر شعاعیں بن کر پھیلنے سے پہلے ہی مٹ جاتی ہیں۔

ان سب کے درمیان حقیقی چراغ وہ ہے جو تاریکیوں کے یلغار کے مقابلے میں اپنی تابانی اور نور افشانی میں اضافہ کرے، اپنے اندر جلنے سے نہ ڈرے، ڈٹا رہے اور کمزوری و سستی کو اپنے قریب نہ آنے دے۔ وہ تاریکی کے ہولناک حملوں کے سامنے سو بار جھکے، مگر پھر سیدھا کھڑا ہو جائے، اور بالآخر اپنی روشنی کے واضح اور نمایاں آثار تاریکیوں کے بیچ چھوڑ جائے۔

یہ عالم آرا چراغ درحقیقت وہی دانشمند انسان ہے جو اپنے علم پر یقین رکھتا ہے، اس کے تقاضوں کے مطابق عمل کرتا ہے، اور حق کو—خواہ وہ

کتنا ہی تلخ کیوں نہ ہو اور عوام کے وہم و گمان اور جاہلوں کی خرافات سے کس قدر ہی متصادم کیوں نہ ہو—بے خوف بیان کرتا ہے، چاہے اس سے مخالفت اور عناد ہی کیوں نہ ابھر آئے۔ اور جب وہ دیکھتا ہے کہ گمراہ لوگ جہالت اور ضلالت کی گندی اور ہلاکت خیز کوٹھڑیوں کے خوگر ہو چکے ہیں اور جان کی قیمت پر بھی انہیں چھوڑنے پر آمادہ نہیں، تو وہ انہیں تھام کر نور، نجات اور سعادت کی طرف رہنمائی کرتا ہے، اور ان عظیم فرائض کی ادائیگی کے لیے صراحتِ بیان اور جرأت کے زیور سے آراستہ ہوتا ہے۔

مرحوم شریعت سنگلجی ایسے ہی عظیم انسانوں میں سے تھے، اور جن لوگوں نے استادِ بزرگ کی وفات کے بعد حالیہ مہینوں میں یہ کہا اور لکھا کہ صدیوں تک گزر جائیں گی مگر عالمِ اسلام میں ان جیسا شخص دوبارہ پیدا نہیں ہوگا، انہوں نے قطعاً مبالغہ نہیں کیا۔

اسی مختصر سے رسالے میں—جو شاید مرحوم شریعت کے ممتاز آثار کے درمیان اہمیت کے اعتبار سے دوسرے یا تیسرے درجے پر ہو—ان کے علم و آگاہی کی وسعت، ان کی جرأت، صراحتِ بیان اور حق گوئی کے مسلم شواہد صاف طور پر مل جاتے ہیں۔ اس موجودہ رسالے کے مضامین تنہا ہی خرافات اور موہومات کے ایک پورے سلسلے کو—جو صدیوں سے

نادان مفسرین، دین کے نام نہاد علمبرداروں، جاہل یا غرض پرست واعظوں کے ذریعے عوام الناس کے ذہنوں اور دلوں کی گہرائیوں میں، بلکہ متوسط اور اعلیٰ طبقے کے اکثر افراد میں بھی جڑ پکڑ چکا تھا—جڑ سے اکھاڑ پھینکتے ہیں۔

یہ رسالہ اسلام اور قرآن کے دامن کو اُن نقصان دہ تاویلات اور غلط تفسیروں سے پاک کرتا ہے جو عقلِ سلیم سے مطابقت نہیں رکھتیں اور اسلام کے دشمنوں اور مخالفین کے ہاتھ میں ہتھیار فراہم کرتی ہیں، اور حقائقِ امر کو معقول اور ناقابلِ تردید دلائل کے ساتھ دوبارہ واضح کر دیتا ہے۔ شاید بظاہر یہ کام آسان معلوم ہو، مگر حقیقت میں یہ بے حد مشکل ہے کہ کوئی ایک فرد ہزاروں کھوکھلے ذہنوں اور کم مایہ لوگوں کے مقابل کھڑا ہو، اور لاکھوں ایسے متعصب، آنکھ اور کان بند کیے ہوئے اور گمراہ عقیدہ رکھنے والوں کے سامنے پوری قوت کے ساتھ سچائی کو بلند آواز میں بیان کرے، واضح الفاظ میں تحریر کرے، اور ہزار برس سے رائج غلط کتابت اور ناروا گفتار پر کھلی طور پر خطِ بطلان کھینچ دے۔

پس معزز قارئین مجھے یہ حق دیں گے کہ میں مرحوم شریعت کی اس فضیلت کو ان کے تمام فضائل میں سب سے بڑا شمار کروں، اور ان کی زندگی کی تاریخ قلم بند کرنے سے پہلے اسی موضوع کی وضاحت کو ضروری سمجھوں۔

البتہ مرحوم استاد کی زندگی کو چار الفاظ میں سمیٹا جا سکتا ہے: تقویٰ، علم، افاضہ اور مجاہدہ۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہی چار لفظوں سے ایک پانچواں لفظ بھی لازماً وجود میں آیا، جسے ہمارے عہد میں ان اوصاف کا منطقی اور معقول نتیجہ کہا جا سکتا ہے، اور وہ ہے رنج و ملال۔ تاہم اس نکتے پر دل کو تسلی دینی چاہیے کہ علم، تقویٰ اور جہاد کے حامل تمام عظیم انسانوں کے حصے میں زندگی میں رنج و ملال کے سوا کچھ نہیں آیا۔

بدقسمتی سے اس مسلسل رنج و الم کا ایک بڑا نتیجہ یہ نکلا کہ استادِ بزرگ کی وفات وقت سے پہلے واقع ہوئی، اور انتقال کے وقت ان کی عمر ۵۳ برس سے زیادہ نہ تھی۔

مرحوم شریعت ۱۳۱۰ھ ق (مطابق ۱۲۷۱ھ ش) میں تہران میں علم و تقویٰ کے ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ ان کے والد مرحوم حاج شیخ حسن سنگلجی اور ان کے دادا مرحوم حاج رضاقلی اپنے زمانے کے جلیل القدر فقہا، زاہدوں، باعلم، پاکدامن اور شجاع علما میں شمار ہوتے تھے، اور ان کے آثار و حالات اہلِ علم و فضیلت میں معروف ہیں۔ مرحوم حاج شیخ حسن نے اپنے معزز فرزندوں کی تعلیم و تربیت میں غیر معمولی سنجیدگی اور اہتمام سے کام لیا، یہاں تک کہ تینوں

بھائیوں نے جوانی کے آغاز ہی میں ابتدائی علوم مکمل کر کے اعلیٰ علوم کی تحصیل شروع کر دی۔ (بد قسمتی سے مرحوم آقا محمد مہدی سنگلجی کی ناگہانی وفات، جو اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے صرف دو ہفتے بعد ہوئی، کے بعد حجۃ الاسلام آقای محمد سنگلجی کے سوا اس خاندان سے کوئی باقی نہ رہا۔)

مرحوم شریعت نے تہران میں اپنے زمانے کے بڑے بڑے علما کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ فقہ مرحوم حاج شیخ عبدالنبی مجتہد نوری سے پڑھی، حکمت مرحوم مرزا حسن کرمانشاہی سے حاصل کی، علمِ کلام مرحوم حاج شیخ علی متکلم نوری سے سیکھا، اور عرفان مرحوم مرزا ہاشم اشکوری سے پڑھا۔ اس کے علاوہ ان علوم اور دیگر شعبوں میں بھی انہوں نے اکابر اساتذہ سے بھرپور استفادہ کیا۔

جب وہ اپنے بھائی آقای آقا محمد سنگلجی کے ہمراہ نجفِ اشرف مشرف ہوئے تو ان کا فضل و علمی احاطہ وہاں کے جلیل القدر اساتذہ اور مدرسین کی تحسین و تعجب کا باعث بنا۔ تہران واپسی کے بعد مرحوم شریعت نے حکما، فلاسفہ، طبیعیات دانوں، اہلِ منطق و کلام—خصوصاً مغربی مفکرین—کی کتب و آثار کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کیا، اور اسلامی و عرب ممالک کے ممتاز علما سے علمی روابط قائم کیے۔ ان دروس اور مطالعات کے نتیجے میں ان کے علمی دائرے میں بے پناہ وسعت پیدا ہوئی اور وہ ایک بے

مثال جامعیت کے درجے تک پہنچ گئے، یہاں تک کہ مابعد الطبیعیات کے علوم میں بھی، اور فقہ و شرائع میں بھی، صاحبِ نظر قرار پائے اور اپنے عہد کے یگانۂ روزگار بن گئے۔

مشرق و مغرب کے بعض نامور علما، مسیحی نمائندوں، اور بعض یورپی و امریکی رجال و سیاحوں کے ساتھ ان کے علمی محاضرات اور مباحثات اہلِ اطلاع میں مشہور ہیں، اور آج بھی تعجب اور تحسین کا باعث سمجھے جاتے ہیں۔

نجفِ اشرف روانگی سے قبل مرحوم سنگلجی کے پاس وعظ، خطابت اور تدریس کے لیے ایک مستقل منبر موجود تھا۔ اس منبر کی ابتدا تقریباً تیس برس قبل مدرسۂ سنگلج کے ایک حجرے میں چند دوستوں اور ہم درس ساتھیوں کی موجودگی میں ہوئی، اور ابتدا میں اس کی صورت ایک درسی مباحثے کی سی تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں قوت اور وسعت پیدا ہوئی اور اسے مرحوم حاج شیخ حسن سنگلجی کی مسجد کے اندر منتقل کر دیا گیا، جہاں زیادہ تعداد میں لوگ اس سے استفادہ کرنے لگے۔ نجفِ اشرف کی جانب روانگی کے باعث یہ علمی و تبلیغی محفل موقوف ہو گئی، مگر چار برس سے کچھ زیادہ مدت کے بعد، سنہ ۱۳۴۰ھ ق میں، آقایانِ سنگلجی کی نجف سے واپسی کے فوراً بعد یہ سلسلہ دوبارہ قائم ہوا اور تیزی کے ساتھ فروغ پانے لگا۔

بارہ برس قبل ان خطابات کے سامعین—جو ابتدا ہی سے جمعرات کی راتوں میں دیے جاتے تھے—اتنی کثرت اختیار کر گئے کہ مسجد کی گنجائش ناکافی ہو گئی۔ چنانچہ مرحوم شریعت کی سعی و کاوش اور دوستوں اور اہلِ خیر و احسان کے تعاون سے اسی مسجد کے مقام پر، گزرِ تقی خان میں، دارالتبلیغِ اسلامی کے نام سے ایک نئی مسجد تعمیر کی گئی۔

پانچ برس قبل، سنگلج کے علاقے کی خستہ حالی کے نتیجے میں، ایک بار پھر استادِ بزرگ کی ہمت، پشتکار اور والہانہ دلچسپی نے موجودہ مسجد دارالتبلیغ کی تعمیر کو ممکن بنایا، جو تہران کی خیابانِ فرهنگ پر قائم ہوئی۔ اس کے بعد جب استادِ بزرگ نے بیت اللہ کا قصد کیا اور فرائضِ دینی کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حجاز، مصر اور دیگر علاقوں کے علما سے قریبی علمی روابط استوار کیے، پھر تہران واپس آ کر مزید جوش اور مجاہدانہ عزم کے ساتھ تبلیغ و تربیت کے کام میں مصروف ہو گئے، تو اسی دارالتبلیغ کا ایک گوشہ بالآخر یومِ تاسوعا، سنہ ۱۳۶۳ھ ق (مطابق ۱۵ دی ۱۳۲۲ھ ش) کو اس سعید مرحوم کا مدفن بنا۔

یہ ترپن برس کی زندگی تقویٰ، بزرگواری، مناعتِ طبع اور جوانمردی کے ماحول میں گزری، اور ہر دم علم و جدوجہد کے ساتھ وابستہ رہی۔ مرحوم شریعت سنگلجی کے معنوی اور اخلاقی فضائل کی تشریح و توضیح اس قدر

وسیع ہے کہ اس پر کتابیں لکھی جانی چاہئیں، اور اگر راقم اس راہ میں اپنی کوشش کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے اور اس موضوع پر تحریر کی گئی کتاب کو طبع و نشر کرا دے تو اپنے آپ کو نہایت خوش نصیب اور سرافراز سمجھے گا۔ تاہم اس موقع پر اس حقیقت کے اظہار سے خود کو روک نہیں سکتا کہ مرحوم شریعت نے اپنی پوری عمر صالح اور پاکدامن، دیانت دار اور خوش اخلاق، مہربان اور بردبار انسان کی حیثیت سے بسر کی۔ وہ دوستوں کے لیے فداکار اور دشمنوں کے لیے بھی خیر خواہ، شفیق اور سخی، وطن دوست اور اصلاحِ معاشرہ کے خواہاں تھے۔ اور ان سب صفات سے بڑھ کر وہ ایک حقیقی موحد اور سچے مسلمان تھے۔ ان کا توحید پر ایمان محض عقلی اور علمی ہی نہیں بلکہ وجدانی اور قلبی بھی تھا۔ وہ خدا کی عبادت کرتے تھے، اس کے سچے عاشق تھے، اور اسی روحانی عشق کے سہارے اعلیٰ درجے کے زہد و تقویٰ کی زندگی گزارتے تھے۔ وہ مشتبہ لقمہ نہیں کھاتے تھے، اور نہ ہی دو دن ایک ہی طرز پر بسر کرتے تھے۔ بہت کم ایسی آدھی رات گزری ہوگی کہ آسمان کے کانوں نے ان کی عابدانہ مناجات اور راز و نیاز نہ سنے ہوں، اور ستاروں کی آنکھوں نے ان کے عاشقانہ آنسو نہ دیکھے ہوں۔

آج کی ہماری زندگی پر حاوی مادی روح اور اس کا بہاؤ ان کے لیے نہایت گراں اور ناگوار تھا، لیکن اس کے باوجود وہ گوشہ نشینی اور عزلت اختیار کرنے والے انسان نہ تھے۔ وہ تمام مادی سختیوں کے مقابلے میں دو

مضبوط اور درخشاں ہتھیاروں—یعنی قناعت اور توکل—کے ساتھ پوری استقامت سے ڈٹے رہے اور ثابت قدمی کے ساتھ مزاحمت کرتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ذوقِ سلیم، دستگیری، ہمدردی، تعاون اور سخاوت سے بھی مالا مال تھے۔ جو لوگ ان کے اس کردار سے واقف تھے، یا کبھی ایک مرتبہ ان کی مجلس میں حاضر ہوئے، یا اپنی حاجت میں ان سے مدد پائی —وہ خوب جانتے ہیں کہ اگر وہ کسی کو ایک سال تک عطا کر سکتے تھے، تو کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اپنا واحد کرتا کسی ننگے بدن پر پہنا دیتے، اور خود اس فقید استاد کے ہاتھ میں آدھی روٹی ہی باقی رہ جاتی۔

میں جلد ہی—اگر توفیق ملی—اس مختصر مقدمے کے بعد مرحوم استاد کی زندگی کی خصوصیات کی تفصیل میں داخل ہوں گا، اور اس چھوٹے سے مقدمے کو ایک مفصل کتاب کی صورت دینے کی کوشش کروں گا؛ مگر اگر ایسا نہ ہو سکا تو میں اپنی بات یہیں ختم کرتا ہوں، اور پھر اسی بات پر زور دیتا ہوں کہ مرحوم کے ہم وطن ایرانیوں اور دینی برادری کے افراد کو چاہیے کہ وہ ان کے آثار سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں—بالخصوص ان کی چند جلدوں پر مشتمل شہرۂ آفاق تصنیف «حکمتِ قانون» (یعنی یکتا پرستی اور قرآن فہمی کی کنجی) سے، جو نہایت وضاحت کے ساتھ شائع ہو چکی ہے اور بے مثال تحسین و پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ نیز اس سعید مرحوم کے دوستوں اور شاگردوں کو چاہیے کہ ان کی دیگر تصانیف، خصوصاً مقامات، دورۂ فلسفہ اور ان کے بیانات، پوری دقت کے ساتھ جمع کریں اور شائع کریں، تاکہ یہ

قیمتی مقالات ضائع ہونے سے محفوظ رہیں—میں اس باب میں تمام دوستوں سے پُرزور اپیل کرتا ہوں۔

اللہ تعالیٰ، اپنے لطف و کرم سے، مرحوم دانشمند شریعت سنگلجی کے برادرِ مکرم، حجۃ الاسلام آقای آقا محمد سنگلجی—جو عملاً اور حقیقتاً اس عظیم فقید کے جانشین ہیں—اور اس سعید مرحوم کے معزز فرزندان، آقای آقا محمد باقر سنگلجی اور آقا عبد اللہ سنگلجی کو صحت، درازیِ عمر عطا فرمائے، اور انہیں برادر اور والد کی طرح عقل، کامیابی اور تائید سے سرفراز رکھے۔

تہران: یکم فروردین ۱۳۲۳ھ ش
حسین علی مستعان

# تمہید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

**اَلْحَمْدُ لِلهِ وَالصَّلوةُ عَلي عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى اللَّهُ خَيْرٌ عَمَّا يُشْرِكُونَ. إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمِيْتُمُوها أَنتُمْ وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنزَلَ اللهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَ وَمَا تَهْوَى الْأَنْفُسُ وَلَقَدْ جاءَهُم مِن ربهم الهدي..إِنَّ اللهَ وَمَلائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِي يا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيما.**

ایک ایسی **خرافات اور وہمی عقیدہ** جسے قرآن مجید کے ساتھ منسوب کیا گیا اور مسلمانوں کے عقائد میں شامل ہو گیا، وہ یہ ہے کہ بعض لوگ حضرت خضر، حضرت الیاس اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات پر ایمان رکھتے ہیں۔

یہ عقیدہ دراصل **اہلِ کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ** سے ماخوذ ہے، اور مسلمانوں کی طرف سے قرآن پر تدبر نہ کرنے کے سبب یہ عقیدہ اتنا عام ہو گیا کہ لوگوں نے اسے اسلام کا مسلمہ جزو سمجھ لیا۔ عوام الناس میں یہ تصور پیدا ہو گیا کہ یہ عقیدہ دین کا ضروری حصہ ہے، اور جو اس کی تردید کرے وہ نبی اکرم ﷺ کے خلاف ہوگا۔ مزید عجیب بات یہ ہے کہ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن بھی اس حیات کی تصدیق کرتا ہے۔

حالانکہ اگر غور و تدبر کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن اس بات کے

خلاف ہے، اور مضبوط دلائل کے ساتھ اس افسانوی عقیدے کی نفی اور اس وہمی تصور کی سخت تردید کرتا ہے۔

یہاں ہم بیان کریں گے کہ کتابِ خدا اور سنتِ ختمی ﷺ انبیاء کی وفات خصوصاً حضرت خضر، حضرت الیاس اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتی ہیں، تاکہ مسلمانوں کے لیے حقیقت واضح ہو جائے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ ''حالانکہ عوام الناس پر جہالت و نادانی غالب ہے اور جھوٹ کے دعویدار تمہارے خلاف دشمنی رکھتے ہیں، تو پھر تم خود کو جہال و عوام کے شور و غوغا اور بدعت و ضلالت کے دشمنوں کی نفرت کے سامنے کیوں مبتلا کرتے ہو؟ اور اس حقیقت کو بیان کرنے کی ضرورت کیا ہے؟''

تو میں جواب دیتا ہوں کہ میرا بنیادی مقصد قرآن کو خرافات اور اباطیل کے حملوں سے محفوظ رکھنا ہے۔ قرآن ایک عقلی و علمی کتاب ہے اور اسے انسان کی زندگی کے ہر دور میں رہنما اور ہادی ہونا چاہیے۔

یہ جھوٹے نسبتیں اور افتراء قرآن کی قدر و منزلت کو کم کر دیتے ہیں، اور علما و دانشور قرآن کی رہنمائی سے دور ہو جاتے ہیں۔ اگر قرآن سے ایسے وہمی عقائد کی نسبت کو ختم کر دیا جائے تو قرآن اہلِ عقل کے نزدیک کوئی حقیر کتاب نہیں رہے گا۔

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں، بہت سی مسلم فرقے اور گروہ ہر وہم و گمان کو قرآن سے منسوب کر دیتے ہیں، ہر مذہب اپنی بدعت اور ضلالت کو قرآن سے دلیل قرار دیتا ہے، اور ہر گروہ اپنی فاسد آراء و عقائد کی تصدیق کے لیے قرآن کا حوالہ دیتا ہے۔ آخرکار، سب متضاد گروہ قرآن کے نام پر بات کرتے ہیں۔ کیا قرآن خود متناقضات کا مجموعہ، یا وہمات و خرافات کا ماخذ ہے؟ قطعا نہیں۔

افسوس کی بات ہے کہ یہ وہمی اور خرافی نسبتیں قرآن کی حقیقی حقیقت کو مسلمانوں کے ہاتھ سے لے گئیں اور اسلام اہلِ عقلِ دنیا کے لیے ایک کھیل یا مشق بن گیا۔ اسی وجہ سے، میں نے خدا کی رضا کے لیے اس کام کو انجام دیا اور ملامت کرنے والوں کے ملامت کرنے سے نہیں ڈرا۔

جیسا کہ کہا گیا:

''اَجِدُ الملامَۃَ فی ھواکَ لَذیذۃً ... حُبًّا لِذِکرِکَ فَلْیَلُمنِ اللّومُ''

(میں تیرے عشق میں ملامت کو بھی لذت پاتا ہوں... تیرے ذکر کے عشق میں، ملامت کرنے والا مجھے ملامت کرے تو کرے)

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کا اعتقاد، جو مسلمانوں میں بغیر کسی مستند دلیل کے کتاب و سنت سے مشہور ہوا، نے یہودیوں کے لیے مسلمانوں کے خلاف ایک بحثی راستہ کھول دیا۔ جیسا کہ میں نے یہودیوں کی ایک کتاب دیکھی، جس میں حضرت عیسیٰ کی

اشرفیت کو نبیِ ختمی ﷺ پر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اور اس کا دلیل کے طور پر یہی بیان پیش کیا گیا کہ:

اولاً، مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور آسمان میں ہیں، جبکہ نبی اکرم ﷺ وفات پا گئے اور مدینہ منورہ میں دفن ہوئے۔

ثانیاً، حضرت مسیح علیہ السلام بغیر والد کے پیدا ہوئے، مگر ناپاک نطفہ سے نہیں تھے۔

ثالثاً، حضرت مسیح علیہ السلام نے کسی سے نکاح نہیں کیا، جبکہ نبی اکرم ﷺ کے لیے ہر ایسی عورت جس پر نظر پڑتی یا جس سے رغبت ہوتی، اس کا شوہر کے لیے حرام ہو جاتا۔

یقیناً یہ نوعیت کی مغالطہ بازی، اگرچہ کمزور مسلمانوں کو نصاریہ نہیں بناتی، لیکن ان کے ایمان کو متزلزل کر سکتی ہے۔

اسی طرح، حضرت عیسیٰ کی آسمانی حیات اور حضرت خضر و الیاس کی زمینی حیات کا عقیدہ یہ سبب بنی کہ لوگ حق تعالیٰ کے بجائے بتوں اور معبودوں کی طرف رجوع کرنے لگے۔ جیسا کہ نصاری حضرت عیسیٰ سے حاجات طلب کرتے ہیں، اس کے لیے نذر و قربانی کرتے ہیں، اور بہت سے مسلمان حضرت خضر اور الیاس سے مدد طلب کرتے ہیں

اور شدائد میں ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، جس سے شرک و بت پرستی مکمل طور پر فروغ پاتی ہے۔

پس ضروری ہے کہ ان بتوں کو توڑا جائے تاکہ لوگ متوجہ خدایِ عالم ہوں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ مجھے یہ بات واضح اور روشن انداز میں اپنے مسلمان بھائیوں تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

إِنۡ أُرِيدُ إِلَّا الۡإِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ وَمَا تَوۡفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيۡهِ تَوَكَّلۡتُ وَ إِلَيۡهِ أُنِيبُ۔

(میں اپنی استطاعت کے مطابق صرف اصلاح چاہتا ہوں، اور میری توفیق صرف اللہ تعالیٰ سے ہے، میں اس پر توکل کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔)

شریعت سنگلجی

# مقدمہ

ہم یہاں یہ نہیں کہنا چاہتے کہ یہ ناممکن یا محال ہے کہ کوئی انسان طویل عمر پائے، اور یہ بھی نہیں کہ اللہ تعالیٰ قادر نہیں کہ کسی انسان کو طویل مدت تک زندہ رکھے۔ ہم صرف یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ کتابِ خدا اور سنتِ رسول اکرم ﷺ میں حضرت عیسیٰ، حضرت خضر اور حضرت الیاس کی حیاتِ جاودانی کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے، بلکہ ان کی وفات اور انتقال کی تصدیق کرنے والے مضبوط دلائل ہمارے پاس موجود ہیں۔

## تمام انبیاء و رسل علیہم السلام کی وفات پر قرآن سے استدلال

**آیتِ اول:** اللہ تعالیٰ فرماتا ہے (سورہ آل عمران: ۱۴۴):

وَ ما مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ قَدۡ خَلَتۡ مِن قَبۡلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنۡ مَاتَ أَوۡ قُتِلَ انۡقَلَبۡتُمۡ عَلَى أَعۡقَابِكُمۡ وَمَن يَنقَلِبۡ عَلَى عَقِبَيۡهِ فَلَن يَضُرَّ اللهَ شَيۡئًا وَ سَيَجۡزِي اللهُ الشَّاكِرِينَ

**ترجمہ:**
محمد ﷺ محض ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی کئی رسول گزر چکے ہیں۔ کیا اگر وہ وفات پائیں یا قتل کیے جائیں تو تم اپنے عقائد سے پھیر جاؤ گے؟ جو شخص اپنے سابقہ گناہ اور کفر کی طرف پلٹتا ہے، وہ اللہ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتا، اور اللہ شکر گزاروں کو جزا دے گا۔

**تفسیر مظہری** میں اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے کہا گیا ہے:

*قد خلت ای مضت و ماتت من قبلہ الرسل فسیموت ھو ایضاً*
یعنی ان سے پہلے کے رسول گزر چکے اور وفات پا چکے، اسی طرح محمد ﷺ بھی وفات پائیں گے۔

**تفسیر ابی السعود** (جلد سوم، صفحہ ۸۵) نے بھی تقریباً یہی بیان کیا ہے۔

تفسیر بیضاوی میں فرمایا گیا:

فسیخلوا کما خلوا من قبل

یعنی محمد ﷺ محض ایک رسول ہیں، اور ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے اور وفات پا چکے ہیں۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ محمد ﷺ بھی بالآخر وفات پائیں گے، اور اگر وہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کافر و مرتد لوگ واپس اپنے غلط عقائد کی طرف نہ پلٹیں۔ جو شخص اپنے سابقہ کفر اور شرک کی حالت میں لوٹے گا، وہ اللہ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتا، اور اللہ شکر گزاروں کو جزا دے گا۔

یہ مبارک آیت **جنگ احد** کے موقع پر نازل ہوئی اور اس میں **سید الانبیاء ﷺ کی موت کو استقراء کے ذریعے واضح کیا گیا**، یعنی جس طرح کہ انبیاء و رسل پیش از محمد ﷺ وفات پا گئے اور کوئی باقی نہ رہا، اسی طرح محمد ﷺ بھی جو کہ ایک رسول ہیں، فوت ہو جائیں گے۔

اسی آیت کی بنیاد پر **حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حجت دی** اس دن جب رسول خدا ﷺ وفات پا گئے اور بعض لوگ ان کی موت پر اختلاف کر رہے تھے۔ عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نبی ﷺ حقیقتاً نہیں مرے بلکہ واپس آئیں گے اور منافقین کے ہاتھ اور پاؤں پکڑیں گے۔

**لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عمر رضی اللہ عنہ کی بات کی سخت تردید کی** اور انہیں شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کے بعد وہ چند صحابہ

کے ہمراہ مسجد گئے اور منبر پر کھڑے ہو کر، وہاں موجود تمام صحابہ کو جمع کیا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حمد وثنا بجا لائی، اور فرمایا:

**اعلموا أَنَّ رَسُولَ اللہِ قَدْ تُوُفِّيَ فَمَن كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّداً فَإِنَّ مُحَمَّداً قَدْ مَاتَ وَ مَنْ كَانَ يَعْبُدُ اللَّهَ فَإِنَّهُ حَيٌّ لَايَمُوتُ**

''اے لوگو! جان لو کہ رسول اللہ ﷺ فوت ہو گئے۔ جو محمد ﷺ کی عبادت کرتا ہے، محمد مر چکے۔ اور جو اللہ کی عبادت کرتا ہے، وہ زندہ ہے اور کبھی نہیں مرتا۔''

اس کے بعد حضرت ابوبکر نے یہ مبارک آیت پڑھ کر لوگوں کو سمجھایا:

وَ ما مُحَمَّدٌ الا رسول...

یعنی، ای لوگو! جان لو کہ نبی ﷺ کی وفات ہو گئی، اور جو لوگ محمد ﷺ کو پرستش کرتے ہیں، وہ مردہ ہیں، جبکہ اللہ جو محمد ﷺ کا خدا ہے، زندہ ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے **رسول خدا ﷺ کی وفات کو سابقہ انبیاء کی موت سے استدلال کیا**، یعنی چونکہ تمام انبیاء وفات پا چکے، اسی طرح محمد ﷺ بھی فوت ہو گئے۔

جب صحابہ نے یہ استدلال سنا تو انہوں نے **بالکل بھی اس کی تردید نہیں کی** اور نہ کہا کہ ای ابوبکر! تمہارا استدلال غلط ہے یا ناقص ہے۔

اگر صحابہ حضرت خضر، حضرت الیاس اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات کے قائل ہوتے اور یہ بات مسلمانوں کے عقائد میں مسلمہ ہوتی، تو وہ یہ کہتے کہ ابوبکر کس طرح اس آیت سے استدلال کر سکتے ہیں، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ عیسیٰ، خضر اور الیاس زندہ ہیں، تو محمد ﷺ بھی کیوں نہ زندہ ہوں؟ لیکن عمر نے حضرت ابوبکر کے قول کو رد نہیں کیا بلکہ سب خاموش ہو گئے، ان کا قول قبول کیا، اور کہا:

إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ

اور انہوں نے گذشتہ انبیاء کی طرف دیکھا، تو دیکھا کہ سب وفات پا چکے اور کوئی خالد نہیں رہا، اس لیے انہوں نے **حضرت رسول ﷺ کی وفات پر یقین کر لیا۔**

**یہ آیت ایک منطقی استدلال کی پہلی شکل کی نشاندہی کرتی ہے:**
حضرت عیسیٰ، حضرت خضر اور حضرت الیاس بھی محمد ﷺ سے پہلے کے رسول تھے، اور ہر رسول جو محمد ﷺ سے پہلے آیا، وفات پا گیا، تو **پھر حضرت عیسیٰ، حضرت خضر اور حضرت الیاس بھی فوت ہو چکے ہیں۔**

یہ منطقی شکل (سلسلہ دلیل) درج ذیل شرائط پر مشتمل ہے:

1. **ایجاب صغری (جزوی دلیل):** ہر سابقہ رسول وفات پا چکا۔
2. **کلیہ کبری (عمومی قاعدہ):** ہر رسول کی وفات لازمی ہے۔

اس طرح نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ سابقہ انبیاء کی طرح یہ بھی فوت ہو چکے ہیں۔

آیتِ دوم: (سورہ انبیاء: ۲۱، آیات ۷ و ۸)

وَ ما أَرسَلنَا قَبلَکَ إِلَّا رِجَالًا نُوحِي إِلَيهِمۡ فَاسۡأَلُوا أَهلَ الذِّكرِ إِنۡ كُنتُمۡ لَا تَعلَمُونَ. وَ مَا جَعَلنَاهُمۡ جَسَدًا لَّا يَأۡكُلُونَ الطَّعَامَ وَ مَا كَانُوا خَالِدِينَ

ترجمہ:
ہم نے آپ ﷺ سے پہلے کسی نبی کو نہیں بھیجا مگر وہ مرد تھے جن کی طرف ہم نے وحی بھیجی۔ یعنی کوئی نبی فرشتہ یا مخلوقِ غیر انسانی نہیں تھا، بلکہ سب انسان تھے۔ اگر تمہیں یہ معلوم نہیں تو اہلِ ذکر سے پوچھو۔ ہم نے انبیاء کو ایسا جسم نہیں دیا جو کھانا نہ کھائے، اور نہ ہی وہ خالد و جاویدان تھے۔

یعنی یہ آیت واضح کرتی ہے کہ انبیاء بشر تھے، کھاتے پیتے تھے اور وہ بھی تمہارے جیسے انسان تھے، مگر خالد نہیں تھے۔

فرق جسم اور جسد:

- جسم: وہ تن ہے جس کے ساتھ روح موجود ہو، چاہے وہ نباتی، حیوانی یا انسانی ہو۔ ایسے جسم کی فطرت یہ ہے کہ وہ تغذیہ لیتا ہے، بڑھتا ہے اور نسل پیدا کرتا ہے۔
- جسد: مردہ جسم، یعنی وہ تن جس میں روح نہ ہو۔

اس بات کی وضاحت کے لیے ایک اور آیت دیکھی جا سکتی ہے:

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (۲:۲۴۷)

یعنی اللہ تعالیٰ نے طالوت کو علم اور جسمانی طاقت میں اضافہ دیا۔ یہاں جسم کا مطلب تن ہے۔

جیسے کہا جاتا ہے، طالوت ایک خوش صورت اور رشید انسان تھے، تو اسی طرح اس آیت میں بھی **جسم بمعنی تن ہے، نہ کہ مجرد یا غیر انسانی وجود۔**

اسی طرح یہ مبارک آیت بھی جسم کے مفہوم کو واضح کرتی ہے:

وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ (سورہ قصص: ۶۳:۴)

یعنی جب تم منافقین کو دیکھو گے تو ان کے **جسموں کی رشادت اور خوبصورتی تمہیں حیران کر دے گی۔**

اس سے واضح ہوتا ہے کہ **قرآن اور لغت میں جسم کا مطلب صرف بدن یا جسمانی وجود ہے۔** فلسفیانہ اصطلاح میں جسم وہ جوہر ہے جس کے تین بعد (طول، عرض اور ارتفاع) ہوں، اور یہ اصطلاح اسلام میں **فلسفہ کے داخلے کے بعد، دوسرے صدی ہجری میں وضع ہوئی۔**

**جسد کا مفہوم:**

لغویین کہتے ہیں:

اَلْجَسَدُ كُلَّ خَلقٍ لَا يَأْكُلُ وَلَا يَشْرَبُ

یعنی ہر وہ مخلوق جو نہ کھاتی ہے اور نہ پیتی ہے۔

جسد **بی روح جسم** ہوتا ہے، چاہے پہلے اس میں روح موجود رہی ہو اور پھر نکل گئی ہو، جیسے خشک شدہ درخت، مردہ انسان یا حیوان، یا وہ جس میں کبھی روح داخل نہ ہوئی ہو۔ مثال کے طور پر قرآن میں آیا:

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَى مِنْ بَعْدِهِ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَهُ خُوَارٌ (سورہ اعراف: ۷:۱۴۸)

یعنی قوم موسیٰ نے ان کے جانے کے بعد طور پر پہاڑ سے اپنے زیورات اور ہیرے جواہرات سے گوسالہ بنایا، جو **بی روح جسم** تھا اور آواز بھی دیتا تھا۔ اللہ فرماتا:

أَلَمْ يَرَوْا أَنَّهُ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيهِمْ سَبِيلًا

کیا وہ نہیں دیکھتے کہ یہ گوسالہ ان سے بات نہیں کرتا اور انہیں راستہ بھی نہیں دکھاتا؟

اس مبارک آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم موسیٰ نے گوسالہ وہی بنایا جو ان کے زیورات اور ہیرے جواہرات سے تیار کیا گیا تھا، جو طلا اور چاندی کے زیورات تھے۔ چونکہ یہ گوسالہ بی روح جسم تھا اور صرف مادی شکل رکھتا تھا، اس لیے یہ جسد کے زمرے میں آتا ہے، جسم نہیں۔

سورہ ص: ۳۸، آیت ۳۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمَانَ وَأَلْقَيْنَا عَلَىٰ كُرْسِيِّهِ جَسَدًا ثُمَّ أَنَابَ

ترجمہ:
"ہم نے واقعی سلیمان ﷺ کو آزمائش میں ڈال دیا، اور ان کے تخت پر ایک جسد ڈال دیا، پھر وہ اللہ کی طرف رجوع کر گئے۔"

## توضیح اور روایت:

رسول اکرم ﷺ سے روایت ہے کہ سلیمان علیہ السلام نے فرمایا:

"میں صد عورتوں کے طواف کروں گا تاکہ ہر عورت کا بیٹا پیدا ہو اور اللہ کی راہ میں لڑے۔"

جب انہوں نے طواف کیا، تو ایک عورت حاملہ ہوئی اور ایک ناقص الخلقہ بیٹا پیدا ہوا، جسے سلیمان علیہ السلام نے اپنے تخت پر رکھ دیا۔

رسول ﷺ نے فرمایا:

"اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو یہ بچہ ناقص نہ ہوتا، لیکن سلیمان علیہ السلام نے اللہ کی طرف رجوع کیا۔"

کچھ علماء نے کہا کہ اللہ نے سلیمان علیہ السلام کو **ایسی حالت میں مبتلا کیا جیسے ایک بی روح جسد ہو، جو بالکل حرکت نہیں کر سکتا تھا۔**
کچھ دیگر کا کہنا ہے کہ سلیمان علیہ السلام کا بیٹا اچانک فوت ہو گیا اور اس کا جسد تخت پر پڑ گیا۔

**خالد:**

خلود بمعنی **مکث طویل** ہے، اور لغت میں یہ معنی "لا آخر لہ" کے لیے استعمال نہیں ہوا۔ چنانچہ راغب اصفہانی نے **مفردات** میں فرمایا: ہر وہ چیز جو دیر خراب ہو، عرب اسے **مخلد** کہتا ہے۔ جیسے *اثافي*، یعنی دیگدان یا چولہا، عرب اس کو **خوالد** کہتے ہیں کیونکہ یہ دیر تک قائم رہتا ہے اور طویل مدت بعد خراب ہوتا ہے۔ اصل معنی **چیز کی طویل مدت تک باقی رہنا** ہے۔ اسی طرح کہا جاتا ہے: *رجل مخلد*، یعنی وہ شخص جو دیر پیس ہو اور طویل عمر پائے۔

نیز مثال کے طور پر: *دابہ مخلدۃ*، یعنی وہ حیوان جس کی ثناء و تعریف برقرار رہے، تاکہ اس کا رباعیہ مکمل ہو جائے۔

لہذا ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ **خلود کا لغوی معنی تصدیق یا ابدیت نہیں بلکہ مدت طویل کے لیے باقی رہنا ہے۔** ۔ لہٰذا، اس آیت میں یہی بات بیان کی گئی ہے کہ انبیاء کا خالد ہونا ممکن نہیں اور نہ ہی ان کی زندگی میں طویل مکث قائم رہتی ہے۔

اور آیت کا مفہوم یہ ہے کہ:

ہم نے انبیاء علیہم السلام کو ایسا جسد قرار نہیں دیا کہ وہ خوراک یا زندگی کے وسائل کے محتاج نہ ہوں، جیسے پتھر، لوہا یا دیگر بے جان اشیاء، تاکہ طویل مدت تک باقی رہیں۔ بلکہ وہ جسمانی انسان تھے، اور ہر جسم کو خوراک و وسائل کی ضرورت ہوتی ہے، اور ہر جسم کی زندگی سنتِ الٰہی کے مطابق محدود اور طویل مکث سے عاری ہے۔

لہٰذا، انبیاء علیہم السلام طویل مکث نہیں کریں گے اور ان کی زندگی قدرتی عمر سے تجاوز نہیں کرے گی۔

اگر کہا جائے کہ قرآن نوح علیہ السلام کی عمر کو ہزار سال مقرر کرتا ہے، تو کیا یہ ہزار سال طویل مکث کے زمرے میں نہیں آتا؟

جواب یہ ہے کہ کہا جا سکتا ہے کہ عصر نوح میں انسانی عمر قدرتی طور پر تقریباً ہزار سال تھی۔ جیسا کہ بعض محققین نے بیان کیا، وہ ثابت کرتے ہیں کہ نوح کے طوفان سے قبل انسانی اوسط عمر تقریباً ہزار سال تھی، اور طوفان کے بعد اوسط عمر کم ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ طوفان سے پہلے انسان علف خور تھا، لیکن بعد میں گوشت خور ہو گیا۔ واللہ أعلم بالصواب۔

دوسری بات یہ ہے کہ قرآن واضح کرتا ہے کہ اصولاً انسانی زندگی میں کسی

کا طویل مکث یا خلود ممکن نہیں، اور اس آیت کے مطابق انبیاء بھی اس اصول سے مستثنیٰ نہیں ہیں، اگرچہ کچھ افراد اس اصول سے خارج ہو سکتے ہیں، جیسا کہ نوح علیہ السلام قرآن کے مطابق۔

مزید یہ کہ بعض محققین نے کہا ہے کہ نوح کے زمانے میں سال کے بارہ مہینے نہیں تھے، بلکہ ہر سال صرف ایک قمری مہینہ شمار کیا جاتا تھا۔ کیونکہ رسل اور کبار نے سال و ہفتے کے تعین کے اصول وضع کیے، اور طوفان سے پہلے انسان سورج کی گردش اور فلکیاتی منازل سے سال کی پیمائش سے ناواقف تھا، اس لیے ہر سال کو ایک مہینے کے حساب سے لیا جاتا تھا۔ یہ نظام بعد میں فلکیات کی دریافت کے بعد درست ہوا۔ واللہ أعلم بالصواب۔

آیت سوم (۲۱:۳۴-۳۵):

وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّن قَبْلِكَ الْخُلْدَ أَفَإِن مِّتَّ فَهُمُ الْخَالِدُونَ. كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَنَبْلُوكُم بِالشَّرِّ وَالْخَيْرِ فِتْنَةً وَإِلَيْنَا تُرْجَعُونَ۔

نزولِ آیت کے حوالے سے مقاتل کہتے ہیں کہ جب بعض لوگوں نے کہا کہ پیغمبر مرے گا نہیں، تو اس جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اور بعض دیگر نے کہا کہ چونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم خاتم النبیین ہیں، اس لیے وہ نہیں مر سکتے، کیونکہ ان کے مرنے سے شریعت میں تبدیلی آ جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے ذریعے لوگوں کو آگاہ فرمایا کہ **پیغمبر کا حال دیگر انبیاء کی طرح ہے**؛ جیسا کہ ہر نبی اپنے وقت میں وفات پا گیا، کسی کو خلود حاصل نہیں ہوا اور کوئی طویل مکث نہیں رہا۔ **اسی طرح، پیغمبر آخر الزمان بھی مر جائیں گے۔**

تفسیر روح البیان میں فرمایا گیا ہے:

> ہم نے کسی بھی انسان کو تیرے (یا کسی اور) زمانے سے پہلے **دنیا میں دائمی بقاء یا خلود** کے لیے مقرر نہیں کیا۔ یعنی یہ ہماری سنتِ الٰہی میں شامل نہیں ہے کہ کسی کو دنیا میں مخلد کر دیا جائے، حالانکہ اللہ تعالیٰ اس کے کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔

تفسیر ابن کثیر میں فرمایا گیا ہے کہ: **پیش از تو، اے پیغمبر، کسی بھی انسان کو دنیا میں مخلد نہیں بنایا گیا**، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ

جیسا کہ سابقہ آیات میں بیان ہوا، لفظ **خلد** بمعنی **طویل مکث** لیا جاتا ہے، اس لیے یہ آیت **صریح نص ہے کہ کسی بشر نے پیغمبر سے پہلے دنیا میں طویل مدت تک بقائے دائم نہیں پایا**۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ کچھ انبیاء پیغمبر سے پہلے تھے اور اب بھی زندہ ہیں، تو یہ آیت **واضح طور پر حیات دائمی انبیاء کو نفی کرتی ہے۔**

**معنی آیت:** ہم نے کسی بشر کو تیرے (اے پیغمبر) سے پہلے **مخلد نہیں بنایا**؛ پس جب تو، جو اشرف انبیاء ہے، فوت ہو جائے گا، تو کیا تیرے پیش رو افراد خالد رہیں گے؟ یعنی نہیں، **وہ خالد نہیں ہیں**۔

یہ آیت **شکل اوّل کے لیے ایک اشارہ ہے**، یوں کہ: **مسیح، خضر اور الیاس پیغمبر ہیں، اور کسی بھی پیغمبر کو تیرے (اے پیغمبر) سے پہلے مخلد نہیں بنایا گیا**۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ **مسیح، خضر اور الیاس مخلد نہیں ہیں**۔

عجیب امر یہ ہے کہ جو لوگ **پیغمبروں کی حیات پیش از پیغمبر آخر الزمان** کے قائل ہیں، وہ اپنی بات کی منطقی شفاعت کو نہیں سمجھتے کہ **محمد مصطفی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم خاتم النبیین ہیں**، جیسا کہ قرآن نے نصًا بیان فرمایا، اور شریعت اسلام اور دلیل عقل بھی یہی حکم دیتی ہے (اس کا ذکر یہاں نہیں کیا جا رہا)۔ پھر یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ **عیسی، خضر اور الیاس پیغمبر ہیں اور زندہ ہیں**، جبکہ پیغمبر آخر الزمان کے بعد ان کی حیات کا دعویٰ **خاتمیت نبوت کے حکم سے متصادم** ہے؟

اگر یہ استدلال کیا جائے کہ یہ لوگ **پیغمبری سے معزول ہیں اور امتِ خیر المرسلین کے بعد امت کے افراد ہیں**، تب بھی سوال پیدا ہوتا ہے:

- اگر عیسی زندہ ہیں، تو کیا وہ **انجیل کے مطابق عمل کر رہے ہیں یا قرآن کے تابع ہیں**؟
- خضر اور الیاس کیا ابھی بھی پیغمبر ہیں یا **پیغمبر آخر الزمان کی امت میں شامل ہیں اور امت کے بعد کے مجتہد یا مقلد ہیں**؟

غور کریں، اگر ہم صحیح دقت سے دیکھیں، تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اعتقاد بحیات عیسی، خضر اور الیاس، ان کی نبوت کی مرتبہ کے ساتھ، قرآن اور ضروریات دین سے متصادم ہے۔

# خضر اور الیاس کی موت کے خاص دلائل

ابن جوزی اور صاحب کتاب "اصابۃ فی احوال الصحابۃ" نے حضرت علی بن موسی الرضا علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ خضر علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں۔

اور صاحب صحیح بخاری سے پوچھا گیا کہ کیا خضر و الیاس زندہ ہیں؟
جواب میں فرمایا گیا:
"کیسے زندہ ہوں گے، حالانکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفات سے پہلے فرمایا:

لَایَبقَی عَلَی رَأسِ المِأۃِ مِمَّن ھُوَ الیَومَ عَلَی ظَھرِ الأَرضِ أَحَدٌ

یعنی صد سال بعد کوئی بھی شخص جو آج زمین پر موجود ہے باقی نہیں رہے گا۔"

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں:
اگر خضر علیہ السلام زندہ ہوتے، تو انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں شامل ہونا اور کفار کے ساتھ جہاد کرنا پڑتا، اور دین نبی سے سیکھنا پڑتا، حالانکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دن بدر میں فرمایا:

اللّٰھُمَّ انْ تُھلِکْ ھٰذِہِ العِصَابَۃَ لَاتُعبَدْ فِي الأَرضِ

یعنی "اے اللہ ! اگر تو اس جماعت کو ہلاک کر دے، تو پھر زمین پر تیرے عبادت گزار کوئی باقی نہیں رہے گا۔"

اور یاد رہے کہ **اصحاب بدر کی تعداد تین سو تیرہ** تھی، جن کے نام و نشان معروف ہیں، اور ان میں **خضر و الیاس شامل نہیں تھے۔**

اور **کتاب بحر میں شرف الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابو الفضل مرسی** نقل کرتے ہیں کہ وہ قائل ہیں کہ **خضر علیہ السلام فوت ہو چکے ہیں۔**

اور جو افراد قائل بر موت **خضر و الیاس** ہیں، ان میں **قاضی ابو علی** بھی شامل ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"کیسے خضر و الیاس زندہ ہیں، حالانکہ انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہ نماز جمعہ ادا کی، نہ جماعت کے ساتھ عبادت کی، اور نہ جہاد کیا، حالانکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَوْ كَانَ مُوسَى حَيًّا مَا وَسِعَهُ إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَنِي

یعنی: قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر موسی علیہ السلام زندہ ہوتے، تو ان کے پاس میرے پیچھے چلنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔"

آیت ۷۵:

وَ إِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُم مِّن كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُم مِّنَ الشَّاهِدِينَ

ترجمہ:

اور جب خدا نے انبیاء سے ان کا پیمان لیا، جب آپ کو دیا تھا کتاب اور حکمت، پھر آپ کے پاس آیا رسولی تصدیق کرنے والا اس پر جو آپ کے پاس ہے، تاکہ اس پر ایمان لائیں اور اسے یاری کریں۔ خدا نے فرمایا: "کیا تم نے اقرار کیا اور اس پر میرا پیمان لیا؟" انہوں نے کہا: "ہاں، اقرار کیا۔" پھر فرمایا: "پس گواہی دیں، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔"

شیخ بدرالدین قونوی اپنی کتاب تبصرة المبتدی و تذکرة المنتهی میں فرماتے ہیں کہ خضر علیہ السلام عالم مثال میں موجود ہیں۔

اور عبدالرزاق کاشی کا قول ہے کہ خضر کا تعلق بسط سے اور الیاس کا تعلق قبض سے ہے۔

اور بعض صوفیہ فرماتے ہیں کہ: خضر ایک مقامی از مقامات نفس ہے، یعنی ایک مقام روحانی جو بعض صالحین حاصل کرتے ہیں۔

# موت خضر و الیاس پر عقلی دلائل

اگر خضر اور الیاس، نوح علیہ السلام سے پہلے موجود تھے تو لازم تھا کہ وہ نوح کے ساتھ کشتی میں سوار ہوتے، حالانکہ کسی معتبر روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔

1. علما کا اس بات پر اتفاق ہے کہ جب نوح علیہ السلام کشتی سے باہر تشریف لائے تو جو لوگ ان کے ساتھ تھے، سب وفات پا چکے تھے، اور سوائے نسلِ نوح کے کوئی باقی نہ رہا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبَاقِينَ ﴾ (الصافات: 76)

یعنی: ہم نے صرف نوح کی اولاد ہی کو باقی رکھا۔

2. اگر یہ بات صحیح ہوتی کہ کوئی انسان حضرت آدم کے زمانے سے لے کر دنیا کے بالکل اختتام تک زندہ رہے، تو یہ ربوبیتِ الٰہی کی عظیم ترین نشانیوں اور تخلیق کے عجائبات میں سے ہوتی، اور لازم تھا کہ قرآنِ مجید میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر کیا جاتا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح کا ذکر فرمایا جنہیں ہزار برس عمر عطا کی گئی، تو پھر اس شخص کا ذکر کیوں نہ کیا گیا جس نے ہزاروں سال عمر پائی ہو؟

4. خضر اور الیاس کی حیات کا قول، علم کے بغیر اللہ پر بات کرنے کے مترادف ہے، اور نصِ قرآن کے مطابق اللہ پر بلا علم بات کرنا حرام ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ اگر خضر اور الیاس کی حیات ثابت ہوتی تو اس کی دلیل یا تو قرآن سے ہوتی، یا سنتِ رسول سے، یا امت کے اجماع سے۔

حالانکہ یہ قرآن ہے، اس میں خضر کا نام سرے سے آیا ہی نہیں کہ ان کی حیات ثابت ہو، اور الیاس کا نام آیا ہے مگر ان کی زندگی کا کوئی ذکر موجود نہیں۔

رہی سنتِ رسول ﷺ، تو اس موضوع میں ایک بھی صحیح حدیث نہیں پائی جاتی۔

اور رہا اجماع، تو جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا، امتِ محمدیہ کے اکابر علما خود خضر اور الیاس کے انتقال کے قائل ہیں۔

**5.** زیادہ سے زیادہ جن چیزوں پر خضر و الیاس کی حیات کے قائلین اعتماد کرتے ہیں، وہ محض حکایات ہیں؛ کوئی کہتا ہے: میں نے خضر کو دیکھا، دوسرا کہتا ہے: الیاس نے مجھ سے یہ بات کہی۔

سوال یہ ہے کہ کیا خضر اور الیاس کی کوئی ایسی مخصوص علامت ہے جس کے ذریعے انہیں پہچانا جا سکے؟ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں خضر ہوں یا میں الیاس ہوں، تو کیا محض اس کے کہنے سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے؟

کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ شخص فریب کار ہو یا خود کسی وہم میں مبتلا ہو؟

*آنکھ کھلی، کان کھلے، پھر بھی اندھا پن!*
*مجھے حیرت ہے اس خدائی چشم بندی پر!*

**6.** خضر نے حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی صحبت سے خود علیحدگی اختیار کی اور صاف کہہ دیا:

﴿ هَذَا فِرَاقُ بَيْنِي وَبَيْنِكَ ﴾

یعنی: اب میرے اور تمہارے درمیان جدائی ہے۔

تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ موسیٰ کلیم جیسی جلیل القدر ہستی کی رفاقت چھوڑ دے اور ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرے جن کی ہم نشینی سوائے شیطانِ رجیم کے کسی کے ساتھ نہیں ہوتی؟

سبحانک! یہ تو بہت بڑا بہتان ہے۔

**7.** امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں خضر ہوں یا میں الیاس ہوں اور یہ کہے کہ میں نے فلاں حدیث براہِ راست رسولِ اکرم ﷺ سے سنی ہے، تو اس کے اس قول کو ہرگز قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جائے گا، اور ایسا دعویٰ دین میں دلیل نہیں بن سکتا۔

**8.** اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ خضر اور الیاس زندہ ہیں، تو لازماً ان پر جہلاء کی ہدایت اور گمراہوں کی اصلاح فرض ہوگی۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ فریضہ افضل ہے، یا یہ کہ وہ جنگلوں، بیابانوں اور سمندروں میں وحشی جانوروں، درندوں اور مچھلیوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہیں؟

یہ تو محض حماقت اور صریح گمراہی ہے۔

# حضرت عیسی علیہ السلام کی وفات پر قرآنی دلائل

## پہلی آیت:

﴿ إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ﴾

یعنی:
جب اللہ نے فرمایا: اے عیسیٰ! میں تجھے وفات دینے والا ہوں، اور تجھے اپنی طرف بلند کرنے والا ہوں، اور تجھے کافروں سے پاک کرنے والا ہوں، اور تیرے پیروکاروں کو قیامت کے دن تک کافروں پر غالب رکھنے والا ہوں۔

حضرت عیسیٰؑ کی وفات کے قائلین—جیسے شیخ صدوقؒ نے اپنی کتاب *اعتقادات* میں بیان کیا ہے—اور ان کی حیات کے قائلین کے درمیان اصل نزاع لفظ **توفی** اور **رفع** کے معنی میں ہے۔

وفات کے قائلین کہتے ہیں کہ **توفی** کے معنی روح قبض کرنے اور موت دینے کے ہیں، اور **رفع** کے معنی مرتبہ و منزلت کے بلند کرنے کے ہیں۔
جبکہ حیاتِ عیسیٰؑ کے قائلین کہتے ہیں کہ **توفی** کے معنی جسم اور روح کو زمین سے اٹھا لینے کے ہیں، اور **رفع** کے معنی جسم و روح کو آسمان کی طرف اٹھا لینے کے ہیں۔

ہم اس سے پہلے واضح کر چکے ہیں کہ قرآنِ مجید کی آیات کی تفسیر سب سے پہلے خود قرآنِ کریم ہی سے لی جانی چاہیے، اور اگر قرآن میں اس کی توضیح نہ ملے تو پھر سنتِ رسولؐ کی طرف رجوع کیا جائے۔

چنانچہ ہم یہاں:

اوّلًا: قرآنِ مجید کی آیات سے یہ ثابت کریں گے کہ **توفی** کے معنی موت دینا اور **رفع** کے معنی مرتبہ و مقام کا بلند کرنا ہے۔

ثانیًا: احادیثِ نبویہ کے ذریعے اس دعوے کی تائید کریں گے۔

ثالثًا: اہلِ لغت کے اقوال کو اس پر شاہد بنائیں گے۔

# قرآنِ مجید میں لفظ «توفی»

خداوندِ تبارک و تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں لفظ **توفی** کو متعدد مقامات پر **موت اور جان قبض کیے جانے** کے معنی میں استعمال فرمایا ہے، چنانچہ:

1. ﴿ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ﴾

یعنی: تم میں سے وہ لوگ جو **وفات پا جاتے ہیں** اور اپنی بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔

2. ﴿ وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴾

یعنی: ہمیں نیکوکاروں کے ساتھ **وفات دے**۔

3. ﴿ حَتَّىٰ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ ﴾

یعنی: یہاں تک کہ **موت ان کی جان قبض کرلے**۔

4. ﴿ إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ﴾

یعنی: بے شک وہ لوگ جن کی **جانیں فرشتے قبض کرتے ہیں**۔

5. ﴿ هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ ﴾

یعنی: وہی ہے جو **رات کے وقت تمہیں وفات دیتا ہے** اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو اسے جانتا ہے۔

6. ﴿ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا ﴾

یعنی: یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کو موت آپہنچتی ہے تو ہمارے بھیجے ہوئے (فرشتے) اس کی جان قبض کر لیتے ہیں۔

7. ﴿ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَتْهُمْ رُسُلُنَا يَتَوَفَّوْنَهُمْ ﴾

یعنی: جب ہمارے فرستادے ان کے پاس آتے ہیں تو ان کی جانیں قبض کر لیتے ہیں۔

8. ﴿ تَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴾

یعنی: ہمیں اسلام کی حالت میں وفات دے۔

9. ﴿ وَإِنَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ ﴾

یعنی: خواہ ہم تمہیں ان میں سے بعض (عذاب) دکھا دیں جن کا ہم نے ان سے وعدہ کیا ہے یا ہم تمہیں وفات دے دیں۔

10. ﴿ تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ ﴾

یعنی: مجھے اسلام کی حالت میں وفات دے اور نیک لوگوں کے ساتھ شامل فرما۔

11. ﴿ الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ ﴾

یعنی: وہ لوگ جن کی جانیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے ہوتے ہیں۔

12. ﴿ الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ طَيِّبِينَ ﴾

یعنی: وہ لوگ جن کی جانیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاکیزہ ہوتے ہیں۔

13. ﴿ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُمْ ﴾

یعنی: میں اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جو تمہیں وفات دیتا ہے۔

14. ﴿ وَاللَّهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفَّاكُمْ ﴾

یعنی: اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا، پھر وہی تمہیں وفات دے گا۔

15. ﴿ قُلْ يَتَوَفَّاكُم مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ ﴾

یعنی: کہہ دیجئے! تمہیں وہ فرشتۂ موت وفات دیتا ہے جو تم پر مقرر کیا گیا ہے۔

16. ﴿ وَلَوْ تَرَى إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا ﴾

یعنی: اور کاش تم دیکھتے جب فرشتے کافروں کی جانیں قبض کرتے ہیں۔

17. ﴿ اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا ﴾

یعنی: اللہ ہی جانوں کو ان کی موت کے وقت وفات دیتا ہے۔

18. ﴿ وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ ﴾

یعنی: تم میں سے کوئی وفات پا جاتا ہے اور کوئی بدترین عمر کی طرف لوٹا دیا جاتا ہے۔

19. ﴿ فَكَيْفَ إِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلَائِكَةُ ﴾

## حدیث میں «توفی»

1.عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ دَخَلَ عَلَيَّ أَبُو بَكْرٍ فَقَالَ فِي كَمْ كَفَّنْتُمُ النَّبِيَّ قُلْتُ فِي ثَلَاثَةِ أَثْوَابٍ سَحُولِيَّةٍ لَيْسَ فِيهَا قَمِيصٌ وَلَا عِمَامَةٌ وَقَالَ لَهَا فِي أَيِّ يَوْمٍ تُوُفِّيَ رَسُولُ اللَّهِ قَالَتْ يَوْمَ الْإِثْنَيْنِ.

ترجمہ: عائشہؓ سے روایت ہے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ میرے پاس آئے اور پوچھا: "تم نے رسول خدا ﷺ کو کتنے کپڑوں میں کفن کیا؟" میں نے کہا: "تین سادہ کپڑوں میں، جن میں نہ قمیص تھا اور نہ عمامہ۔" پھر ابوبکر نے پوچھا: "رسول اللہ ﷺ کی وفات کس دن ہوئی؟" میں نے کہا: "روز دوشنبہ۔"

2.عَنْ أُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ: تُوُفِّيَتْ إِحْدَى بَنَاتِ النَّبِيِّ فَقَالَ لَنَا اغْسِلْنَهَا ثَلَاثًا۔

ام عطیہ سے روایت ہے کہ پیغمبر ﷺ کی ایک بیٹی وفات پا گئی، تو انہوں نے فرمایا کہ اسے تین مرتبہ غسل دیا جائے۔

3.إِنَّ سَعْدَ بْنَ عُبَادَةَ تُوُفِّيَتْ أُمُّهُ وَهُوَ غَائِبٌ عَنْهَا فَأَتَى النَّبِيَّ فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ أُمِّي تُوُفِّيَتْ وَأَنَا غَائِبٌ عَنْهَا فَهَلْ يَنْفَعُهَا شَيْءٌ إِنْ تَصَدَّقْتُ بِهِ عَنْهَا؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ: فَإِنِّي أُشْهِدُكَ أَنَّ حَائِطِيَ الْمِخْرَافَ صَدَقَةٌ عَلَيْهَا۔

سعد بن عبادہ کی والدہ وفات پا گئی اور وہ وہاں حاضر نہیں تھا۔ اس نے پیغمبر ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! میری والدہ وفات پا گئی، اور میں

وہاں موجود نہیں تھا، کیا اگر میں اس کے لیے صدقہ دوں تو اسے فائدہ پہنچے گا؟پیغمبر ﷺ نے فرمایا: جی ہاں۔ پھر سعد نے کہا کہ میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میرا باغ خرما اس کے لیے صدقہ ہے۔

4.عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ أَخْبَرَنِي أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ الْأَنْصَارِيُّ وَكَانَ تَبِعَ النَّبِيِّ وَخَدَمَهُ وَصَحِبَهُ أَنَّ أَبَا بَكْرٍ كَانَ يُصَلِّي لَهُمْ فِي وَجَعِ النَّبِيِّ الَّذِي تُوُفِّيَ فِيهِ۔
زھری نے کہا کہ انس بن مالک، جو پیغمبر ﷺ کے خادم اور ہمراہ تھے، نے بتایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کے لیے نماز جنازہ پڑھی، جبکہ پیغمبر ﷺ اس بیماری میں مبتلا تھے جس میں وفات ہوئی۔

یہ احادیث واضح طور پر ظاہر کرتی ہیں کہ لفظ توفی بمعنی مرنا استعمال ہوا ہے۔ کتب حدیث میں اس لفظ کی استعمال کی تعداد آٹھ ہزار سے زائد ہے۔ یہ چند احادیث صرف اس بات کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ مدعی کو اس معنی کی تصدیق حاصل ہو اور وفات انبیاء و اولیا کا ثبوت واضح ہو۔

# لغت میں «توفی»

**1.منتہی الارب:**

1.*توفی اللہ فلاناً* — یعنی خدا نے فلاں کی روح قبض کی، یعنی مر گیا۔

**2. اساس البلاغہ:**

*توفی فلان و توفاہ اللہ* — یعنی فلاں فوت ہوا اور خدا نے اس کی روح قبض کر لی۔

**3. اقرب الموارد:**

*توفی المدۃ بلغہا واستکملہا توفی اللہ زیدا قبض روحہ توفی فلان مجہولا قبضت روحہ* — مدت مکمل ہونے پر فلاں کی روح خدا نے قبض کی، کسی کا حال نامعلوم ہو تو اس کی روح بھی قبض ہوئی۔

**4. قاموس:**

*توفاہ اللہ قبض روحہ* — خدا نے اس کی روح قبض کی۔

**5.تاج العروس:**

*توفی فلان اذا مات* — فلاں فوت ہوا۔

**6. لسان العرب:**

*توفی فلان و توفاہ اللہ اذا قبض اللہ نفسہ* — فلاں فوت ہوا اور خدا نے اس کی روح قبض کی۔

### 7.1.صراح اللغہ:

2. و توفاہ اذا قبض روحہ – اور اسے توفی کہا جاتا ہے جب اس کی روح قبض کی جائے۔

### 8.صحاح جوھری:

توفاہ بمعنی توفاہ اللہ ای قبض روحہ – توفی یعنی خدا نے اس کی روح قبض کی۔

### 9.مختار الصحاح:

و توفاہ اللہ اذا قبض روحہ – خدا نے اس کی روح قبض کی۔

یہ لغوی معانی واضح کرتے ہیں کہ لفظ توفی کا اصل مفہوم **قبض روح و مر جانا** ہے۔ جبکہ لفظ رفع بمعنی **رفع منزلت** استعمال ہوا ہے۔ بعد ازاں ہم حدیث کے ذریعے اس مدعی کو ثابت کریں گے اور لغویین کو بھی دلیل کے طور پر پیش کریں گے۔

# قرآن میں رفع

1. وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنَاهُ بِهَا وَلَٰكِنَّهُ أَخْلَدَ إِلَى الْأَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوَاهُ

اور اگر چاہتے تو ہم اسے علم کی بدولت بلند کر دیتے، لیکن اس نے زمین کی طرف رغبت کی اور اپنی خواہش کی پیروی کی۔

2. فِي بُيُوتٍ أَذِنَ اللَّهُ أَن تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ

ان گھروں میں جن میں خدا نے اجازت دی ہے کہ بلند ہوں اور ان میں اس کا نام یاد کیا جائے۔

3. إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ

پاکیزہ کلمات اور نیک اعمال کی طرف خدا کی طرف بلندی حاصل ہوتی ہے، یعنی خدا اسے بلند کرتا ہے۔

4. خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ

روز قیامت کچھ لوگوں کو پست کرتا ہے اور کچھ کو بلند کرتا ہے، یعنی مرتبہ عطا کرتا ہے۔

5. فِيهَا سُرُرٌ مَّرْفُوعَةٌ

جنت میں بلند درجے کے تخت رکھے گئے ہیں۔

6.1. وَفُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ

جنت میں بلند درجے کے فرش بچھائے گئے ہیں۔۔

7.2. فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ قرآن پاک کو گرامی اور بلند مرتبہ صحائف میں محفوظ کیا گیا ہے، جو پاکیزہ اور معزز ہیں۔

## حدیث میں رفع

1. التَّوَاضُعُ لَا يَزِيدُ الْعَبْدَ إِلَّا رِفْعَةً فَتَوَاضَعُوا يَرْفَعُكُمُ اللَّهُ

تواضع شخص کو فقط بلند مرتبہ عطا کرتا ہے، پس تواضع کرو تاکہ خداوند تمہیں بلند کرے۔

2. إِذَا تَوَاضَعَ الْعَبْدُ رَفَعَهُ اللَّهُ إِلَى السَّمَاءِ الرَّابِعَةِ

جب کوئی عبد تواضع کرے تو خداوند اسے چوتھے آسمان تک بلند کر دیتا ہے۔

3. إِنَّ اللَّهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْقُرْآنِ أَقْوَاماً وَ يَضَعُ بِهِ آخَرِينَ

1. خداوند اس قرآن کے ذریعے کچھ اقوام کو بلند اور معزز کرتا ہے اور کچھ کو پست اور ذلیل کر دیتا ہے۔

4.2. عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ جَاءَ رَسُولُ اللَّهِ إِلَى الْعَبَّاسِ يَعُودُهُ فَدَخَلَ عَلَيْهِ وَالْعَبَّاسُ عَلَى سَرِيرٍ لَهُ فَأَخَذَ بِيَدِ النَّبِيِّ فَأَقْعَدَهُ فِي مَكَانِهِ فَقَالَ لَهُ النَّبِيُّ رَفَعَكَ اللَّهُ يَا عَمِّ

3. ابن عباس فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عباس کی عیادت کو آئے، اور عباس اپنے تخت پر بیٹھا ہوا تھا، پس رسول اللہ نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنی جگہ پر بٹھا دیا اور فرمایا: «خداوند تمہیں بلند کرے اے چچا!»

5.1. اللَّهُمَّ اغْفِرْلِي وَارْحَمْنِي وَارْفَعْنِي وَارْزُقْنِي

اے اللہ ! مجھے معاف فرما، مجھ پر رحم کر، مجھے بلند مرتبہ عطا فرما اور روزی دے۔

# لغت میں رفع

1. لسان العرب:

الرفع ضد الوضع و فی اسماء اللہ الرافع ھو الذی یرفع المؤمنین بالاسعاد و اولیائہ بالتقرب و الرفع تقریب الشئ.

رفع، ضد وضع ہے۔ اور اللہ کے ناموں میں «الرافع» وہ ہے جو مومنوں کو سعادت کے ذریعے بلند کرتا ہے اور اپنے اولیاء کو قرب کے ذریعے، اور رفع کا مطلب کسی چیز کو قریب یا بلندی کی طرف لانا بھی ہے۔

2. تاج العروس:

رفع ضد وضع.

رفع، ضد وضع ہے۔

3. صراح اللغہ:

رفع نزدیک گردانیدن کس بکسی صلتہ بالی و من ذلک قولھم رفعتہ الی السلطان.

1. رفع کا مطلب ہے کسی کو کسی کے ساتھ بلند کرنا یا نزدیکی اور مقام عطا کرنا، جیسا کہ کہا جاتا ہے: «میں نے اسے بادشاہ کے پاس بلند کیا۔»

**2.4. قاموس:**

رجل رفیع رجل شریف و الرافع من اسماء اللہ ھو الذی یرفع المؤمنین بالاسعاد و اولیائہ بالتقرب.

رفیع آدمی، شریف آدمی ہے، اور اللہ کے ناموں میں «الرافع» وہ ہے جو مومنوں کو سعادت کے ذریعے بلند کرتا ہے اور اپنے اولیاء کو قرب کے ذریعے۔

# نتیجہ

ان مقدمات سے استقراء کے ذریعے یہ ثابت ہوا کہ جب توفی اور قبض و رفع کا فاعل اللہ تعالیٰ ہو اور مفعول مخلوق، توفی کا مطلب ہے مرنا یا قبض روح، اور رفع کا مطلب ہے مرتبہ بلند کرنا۔

پس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے عیسیٰ! میں تجھے وفات دوں گا، اور مرنے کے بعد تیرا روح بلند کروں گا اور تیری مرتبہ کو معزز و محترم قرار دوں گا۔

## مفسرین کا اختلاف

مفسرین نے اس آیت کی تفہیم میں شدید اختلاف کیا ہے اور اپنی رائے، مقیاس، اور متضاد اقوال یادگار چھوڑے ہیں، اور کسی ایک کلمے پر اتفاق نہیں ہوا۔ ہم یہاں مفسرین کی آراء اور ان پر وارد اشکالات کو ذکر کرتے ہیں تاکہ کوئی شک باقی نہ رہے۔

بعض مفسرین نے کہا کہ معنی „اِنِّي مُتَوَفِّيكَ" یہ ہے کہ „قابضک من الارض حیاً" یعنی اے عیسیٰ! میں تجھے زمین سے زندہ قبض کروں گا، اور „رَافِعُكَ" یعنی بلند کروں گا اور نزد خود لاؤں، اس کے مطابق عیسیٰ ابھی جسمانی بدن کے ساتھ آسمان میں ہے۔ لیکن اس قول کی بطلان کے کئی پہلو ہیں:

1.یہ مفسر توفی کو صرف قبضِ جسم کے معنی میں لے رہا ہے اور نہ ہی کتاب، سنت، یا لغت سے کوئی دلیل پیش کی گئی ہے، جیسا کہ تفسیر کا قاعدہ ہے۔

2.اگر کسی نے ادبی کتب میں تحقیق کی، تو کسی بھی شاھد میں اس معنی کی تصدیق نہیں ملتی، بلکہ اس کے برعکس شواہد بہت زیادہ موجود ہیں، جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا۔

3.مفسرین اعتراف کرتے ہیں کہ ہمارے پاس عیسیٰ کی حیات کے لیے کوئی معتبر دلیل نہیں ہے، سوائے احادیث نزول عیسیٰ کے، اور یہ احادیث موضوع اور بعض اوقات متضاد ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیسے ان بے سروپا اور ساختگی احادیث کی بنیاد پر قرآن کی محکم آیات کی تاویل کی جا

سکتی ہے؟ ایسے موضوعی اور متضاد احادیث، جو عیسائیت کی خرافات سے متاثر ہیں اور کتابِ خدا کے خلاف ہیں، ہمیں واضح طور پر سامنے رکھنی چاہئیں، جیسا کہ شریعت نے حکم دیا ہے۔

4.چنانچہ یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ لفظ „رافعک“ کا معنی زائد ہے، کیونکہ اگر ہم توفی کو زمین سے زندہ قبض کرنے کے معنی میں لیں، تو پھر لفظ رافعک کا مفہوم باقی نہیں رہتا، کیونکہ آیت ایسے بیان کرے گی: "اے عیسیٰ! تجھے زمین سے زندہ قبض کیا جائے۔"

بعض مفسرین نے کہا کہ معنی „إِنِّي مُتَوَفِّيكَ“ یہ ہے کہ „میں تجھے سلا دوں گا“، یعنی اے عیسیٰ! تجھے نیند میں سلا دوں گا اور پھر „رفع“ سے آسمان میں بلند کروں گا۔ وہ اس استدلال کے لیے دو آیات کو دلیل قرار دیتے ہیں:

1. „اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا“
2. „هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ“

لیکن یہ دلیل کئی پہلوؤں سے باطل ہے:

1.پہلی آیت میں „اللَّهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا وَالَّتِي لَمْ تَمُتْ فِي مَنَامِهَا فَيُمْسِكُ الَّتِي قَضَىٰ عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْأُخْرَىٰ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَفَكَّرُونَ“
میں لفظ „توفی“ کا مفہوم قبض روح اور مرنے کے لیے استعمال

ہوا ہے، جیسا کہ „**والتي لم تمت في منامها**“ سے ظاہر ہوتا ہے۔ یعنی جو نفس حقیقی موت سے نہیں گزری، اسے خداوند اپنی نیند میں موت کی حالت میں لے جاتا ہے۔ یہاں لفظ توفی، قرینہ „منام“ کے ذریعے واضح کرتا ہے کہ نیند میں موت ایک مجازی موت ہے، اور اصل معنی موت (حقیقی) ہے۔

معنی آیت:

خداوند تعالی نفسوں کو ان کے موت کے وقت قبض کرتا ہے، اور جو نفسیں خواب میں مرے نہیں ہیں، انہیں اپنی نگہداشت میں رکھتا ہے۔ وہ اس نفس کو روکتا ہے جس کی موت مقرر ہو چکی ہے، اور اسے چھوڑ دیتا ہے جس کی موت مقرر نہیں ہوئی، تاکہ وہ مقررہ مدت تک زندہ رہے۔ بے شک اس میں متفکر لوگوں کے لیے واضح آیات اور نشانیاں ہیں۔

**آیت دوم:**

وَ هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيلِ وَ يَعلَمُ مَا جَرَحتُم بِالنَّهارِ ثُمَّ يَبعَثُكُم فِيهِ لِيُقضَىٰ أَجَلٌ مُسَمًّى ثُمَّ إِلَيهِ مَرجِعُكُم ثُمَّ يُنَبِّئُكُم بِما كُنتُم تَعمَلُونَ

**ترجمہ:**

یہ آیت بھی پہلے والی کی مانند، لفظ **توفی** کو موت کے معنی میں استعمال کرتی ہے، بقرینہ لفظ **لیل** (شب) اور **یبعثکم** (تمہیں دوبارہ زندہ کرنا)۔ یہ واضح اشارہ ہے کہ توفی کا مطلب محض نیند یا خواب میں لانا نہیں ہے، بلکہ مقصود

حقیقی موت اور اس کے بعد بعث ہے تاکہ قیامت کے دن کی بعث کا ثبوت ملے۔ اگر توفی کا مطلب صرف نیند یا خواب میں لانا ہوتا، تو یہاں بعد از توفی کہا جاتا: "ثم یوقظکم"، لیکن قرآن نے کہا "ثم یبعثکم"۔ یہ دلیل واضح ہے کہ توفی حقیقی موت ہے، کیونکہ بعث کا تعلق صرف مردگان سے ہے، اور ایقاظ (جاگانا) صرف نائمین کے لیے استعارات میں آیا ہے۔

**معنی آیت:**

اور وہی خدا ہے جو شب کو تمہیں قبض روح کرتا ہے، یہاں توفی کو موت کے لیے استعارہ کیا گیا ہے تاکہ اس حالت میں غفلت، حرکت کا رک جانا، اور اعضا کے فرائض سے باز رہنے کا تصور پیش آئے۔ وہ جانتا ہے کہ تم دن میں کیا عمل کرتے ہو، پھر تمہیں دن میں دوبارہ زندہ کرتا ہے تاکہ تمہیں مقررہ اجل تک زندگی دی جائے۔ موت کے بعد تمہاری واپسی اسی کی طرف ہے، اور قیامت کے دن وہ تمہیں تمہارے اعمال کی خبر دے گا۔

2.اگر کوئی شخص تحقیق و استقراء کرے تو پائے گا کہ لفظ **توفی** بغیر قرینہ کے کبھی بھی **نیند میں لانے یا خوابانے** کے معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ علماء اصول کا کہنا ہے کہ **قرینہ کے بغیر لفظ حقیقت پر دلالت کرتا ہے** اور قرینہ کے ساتھ ہی مجازی معنی قائم ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ شاعری میں بھی توفی بغیر قرینہ کے کبھی نوم یا خواب کے لیے استعمال نہیں ہوا، جب فاعل خدا اور مفعول مخلوق ہو۔

3.اگر فرض کریں کہ **متوفیک** کو "نیمک" یعنی نیند میں ڈالنے کے معنی میں لیا جائے، تو یہ ایک نیا وعدہ بن جاتا ہے جیسے دیگر وعدے حضرت عیسیٰ کے لیے ہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہوگا کہ تا زمان رفع، حضرت عیسیٰ کبھی بھی نہ سوئیں، اور قائلین اس قول اور ان کے مقلدین کو یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح کبھی رفع سے پہلے نہیں سوئے، کیونکہ اگر پہلے سو چکے ہیں تو یہ فعل لغو اور غیر ضروری ہو جاتا ہے، اور اس کا نسبت خداوند حکیم سے ہونا جائز نہیں۔

4.اگر یہ تأویل درست ہوتا تو آیت مبارکہ:

فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ

میں بھی یہی معنی لاگو ہونا چاہیے تھے، کیونکہ مادہ لفظ ایک ہی ہے۔ اس سے دو نتائج حاصل ہوتے:

اولاً، نصاری یہ مانیں کہ مسیح کو خدا نے **نیند کے بعد** لیا، نہ کہ **حقیقی موت کے بعد**، نہ ہی رفع کے بعد، جیسا کہ معتقدین بحیات عیسی کہتے ہیں۔

ثانیاً، یہ ماننا پڑتا کہ حضرت مسیح اپنی پوری زندگی، جیسا کہ بعض اخبار میں آیا، ایک صدی اور بیس سال تک **کبھی نہیں سوئے**، سوائے ایک بار جب نصاری گمراہ ہوئے، اور فی الحال بھی وہ خوابیدہ ہیں۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ لفظ **متوفیک** بمعنی "ممیّتک" ہے، یعنی عیسیٰؑ مر گئے، لیکن مرنے کے بعد باقی نہ رہے، بلکہ تین دن یا سات دن بعد دوبارہ زندہ ہوئے اور اپنے جسمانی بدن کے ساتھ آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ اور آخر الزمان میں وہ آسمان سے نزول کریں گے، چالیس روز زندگی کریں گے، پھر وفات پائیں گے اور رسول اکرم ﷺ کے قریب دفن ہوں گے۔

لیکن اس قول کی باطل ہونے کی چند وجوہات ہیں:

1. اس قول کے لیے کتابِ خدا یا سنت رسول ﷺ میں کسی قسم کا کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔
2. قرآن کے نصوص حکم دیتے ہیں کہ جو کوئی مر جائے، وہ دنیا میں واپس نہیں آتا، چاہے وہ جنتی ہو یا دوزخی۔ اور ہم نے رجعت کے مسئلے کو مکمل طور پر باطل قرار دیا ہے۔ محترم دانشور فرید تنکابنی کی کتاب **اسلام و رجعت** اس موھوم کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے۔ یہاں ہم چند آیات رجعت بدنیا کے باطل ہونے کے لیے نقل کرتے ہیں اور قارئین کو مزید مطالعے کے لیے مذکورہ کتاب کی طرف رجوع کراتے ہیں۔

1. ﴿ أَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِينَ ۝ إِلَّا مَوْتَتَنَا الْأُولَىٰ وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِينَ ۝ إِنَّ هَٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴾

یہ آیتِ مبارکہ اہلِ جنت کا مقولہ ہے۔ یعنی اہلِ جنت ایک دوسرے سے کہیں گے کہ اب ہمارے لیے کوئی موت نہیں، سوائے اس پہلی موت کے جو دنیا میں آچکی تھی، اور نہ ہی ہمیں کسی عذاب کا سامنا ہوگا۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے۔

یہ آیت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ انسان کے لیے ایک ہی موت ہے، اس کے بعد کوئی دوسری موت نہیں۔ جبکہ رجعت کا قول لازماً دو موتوں کو ماننے کا تقاضا کرتا ہے، لہٰذا رجعت کا عقیدہ قرآن کے صریح حکم کے خلاف ہے۔

2. ﴿ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ وَمَا هُم بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴾

یہ آیتِ مبارکہ اہلِ جہنم کا بیان ہے۔ یعنی برے علماء اور شیطانوں کے پیروکار جب اپنے آپ کو سخت عذاب میں مبتلا دیکھیں گے تو کہیں گے: کاش ہمیں دنیا میں دوبارہ لوٹنے کا موقع مل جاتا، تاکہ ہم اپنے ان پیشواؤں اور گمراہ کرنے والوں سے اسی طرح بیزاری ظاہر کرتے جس طرح آج وہ ہم سے بیزار ہو رہے ہیں۔ اسی طرح اللہ ان کے اعمال کو ان کے سامنے حسرتوں کی صورت میں ظاہر کرے گا، اور وہ کبھی بھی آگ سے باہر نہ نکل سکیں گے۔

اسی مضمون پر دلالت کرنے والی دوسری آیات بھی موجود ہیں، جن میں اہلِ عذاب دنیا میں واپسی کی تمنا کرتے ہیں لیکن انہیں مایوسی کا جواب دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ فَلَوْ أَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴾

یعنی: کاش ہمیں دنیا میں ایک مرتبہ پھر لوٹنے کا موقع ملتا تو ہم ایمان والوں میں سے ہو جاتے۔

اور ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿ أَوْ تَقُولَ حِينَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ أَنَّ لِي كَرَّةً فَأَكُونَ مِنَ الْمُحْسِنِينَ ﴾

یعنی: جب گناہ گار عذاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے تو کہتا ہے: کاش مجھے دنیا میں دوبارہ لوٹنے کا موقع مل جاتا تاکہ میں نیکوکاروں میں شامل ہو جاتا۔

3. ﴿ كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴾ ترجمہ: "کیسے تم اللہ پر کفر کرتے ہو، حالانکہ تم مردہ تھے، یعنی اجسام تھے جن میں حیات نہ تھی، پھر اس نے تمہیں زندہ کیا اور روح کے نفخ سے ابدان میں جان ڈالی۔ پھر وہ تمہیں موت میں مبتلا کرتا ہے اور جب مقررہ وقت آتا ہے تو دوبارہ تمہیں زندہ کرتا ہے۔ پھر تم سب کی واپسی اللہ کی طرف ہوگی۔" تشریح: اس آیت میں دو موتیں اور دو حیات مقرر کی گئی ہیں، اور اس میں کسی بھی قسم کی دنیا میں رجعت کا ذکر نہیں ہے۔

4. ﴿ قَالُوا رَبَّنَا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ ﴾ ترجمہ: "کافر کہتے ہیں: اے ہمارے رب! تو نے ہمیں دو بار موت دی اور دو بار زندہ کیا، پھر ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا، کیا ہمارے لیے کوئی راستہ ہے کہ ہم نجات حاصل کر سکیں؟" تشریح: یہ آیت بھی پہلی آیت کی مانند دو موتیں اور دو حیات بیان کرتی ہے۔ یہاں 'اماتہ اول' مراد نطفہ کی موت ہے، یعنی انسان کی ابتدائی موت (رحم میں نطفہ کا فنا) اور پھر دنیا میں زندہ ہونا۔ بعد ازاں 'اماتہ دوم' دنیا میں موت ہے، اور پھر بعثت کے لیے دوبارہ زندہ کیا جانا۔

5. ﴿ وَ حَرَامٌ عَلَىٰ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴾ ترجمہ: "اور جس بستی کو ہم نے ہلاک کیا، اس کے لوگ دوبارہ دنیا میں واپس نہیں آئیں گے۔"

6. ﴿ أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ ۖ وَإِن كُلٌّ لَّمَّا جَمِيعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُونَ ﴾ ترجمہ: "کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم نے ان سے پہلے کتنے اقوام کو ہلاک کیا، اور وہ کبھی بھی دنیا میں واپس نہیں آئیں گے؟ اور یقیناً سب انسان، چاہے وہ ماضی کے ہوں یا مستقبل کے، قیامت کے دن ہمارے حضور حاضر ہوں گے۔"

7. ﴿ حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ ﴾ ... ﴿ كَلَّا إِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَائِلُهَا وَمِن وَرَائِهِم بَرْزَخٌ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴾

ترجمہ: "کفار جب موت کے قریب آتے ہیں اور حقیقتِ امر سے کچھ حد تک واقف ہوتے ہیں، تو اپنی بی ایمانی اور قصور کا شعور حاصل کرتے ہیں۔ نتیجتاً ان پر حسرت اور ندامت طاری ہو جاتی ہے اور وہ خدا سے رجعتِ دنیا کی درخواست کرتے ہیں، کہتے ہیں: 'اے پروردگار! مجھے دوبارہ دنیا میں بھیج دے، شاید میں عمل صالح کر سکوں اور جو کچھ چھوڑ دیا وہ مکمل کر سکوں۔' لیکن خداوند متعال ان کی درخواست کو بالکل رد فرماتا ہے اور کہتا ہے: 'تم دنیا کی طرف کبھی لوٹ کر نہیں جاؤ گے۔' رجعت و برگشتِ دنیا ایک نظریہ ہے جو بعض لوگ مانتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت میں کوئی بنیاد نہیں۔ ان کے سامنے ایک برزخ قائم ہے جو قیامت کے دن تک برقرار رہے گا۔"

اس آیات محکمات سے واضح ہوتا ہے کہ **جو شخص مر چکا، وہ دوبارہ دنیا میں واپس نہیں آتا۔** یہی دلیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے، جو بعد از تین یا سات دن دنیا سے رخصت ہوئے، ان کے دوبارہ دنیا میں آنے کا کوئی ثبوت نہیں۔ نیز یہ عقیدہ کہ بعض غلاۃ شیعہ یا دیگر لوگ پیغمبر، ائمہ، شیخین، عثمان، معاویہ، یزید یا علی و اولادِ علی دوبارہ دنیا میں رجعت کرتے ہیں، قرآنِ کریم اور آیات محکمات کے مطابق باطل اور غیر مستند ہے۔

سبحان اللہ ! واقعی یہ بہت افسوسناک ہے کہ مسلمان قرآنِ کریم کی طرف رجوع نہیں کرتے اور اس میں تدبر نہیں کرتے۔ نتیجتاً ایک سلسلہ خرافات، جو قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہیں، دین میں داخل کر دی جاتی ہیں اور وہ اسلام اور قرآن کی حقیقت کو بھی بے وقوفانہ ظاہر کرتی ہیں۔

## مقدمات ابطال قول مفسرین درباره عیسیٰ علیہ السلام:

1. بعض مفسرین جو موت کو عیسیٰ علیہ السلام کے لیے قائل ہیں، یا بعد از تکمیل مدت مقرر مسیح ہے یا قبل از آن۔

- اگر بعد از تکمیل مدت ہو، یعنی جب اس کی مقررہ مدت پوری ہو گئی اور وفات ہوئی، تو بلند کرنا بلا شبہ روحانی ہے، نہ کہ جسمانی۔
- اگر موت قبل از تکمیل مدت عیسیٰ ہو، یہ قول محکم قرآن کے خلاف ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ مَا تَسْبِقُ مِنْ أُمَّةٍ أَجَلَهَا وَمَا يَسْتَأْخِرُونَ ﴾

2. بعض مفسرین نے اس آیت ﴿ يَا عِيسَىٰ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَ رَافِعُكَ ﴾ کی تفسیر میں ترتیب فرض کی ہے اور کہا:

"میں تجھے ابھی آسمان کی طرف بلند کرتا ہوں، پھر تجھے آسمان سے زمین پر اتارتا ہوں اور نزول کے بعد تجھے فوت کر دوں گا۔"

ابطال اس معنی کے چند وجوہات ہیں:

1.کوئی بھی مؤمن حق نہیں رکھتا کہ بغیر دلیل قرآن کے الفاظ میں دخل اندازی کرے، تقدیم و تأخیر کرے یا کلمات اللہ کی کتاب میں تبدیلی کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اس عمل کی وجہ سے مذمت فرمائی:

﴿يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ﴾

یعنی وہ کلمات کو ان کے اصل مقامات سے ہٹا دیتے اور اپنی خواہش کے مطابق معانی بدل دیتے تھے۔ جو تقدیم و تأخیر بعض مفسرین نے کی، وہی عمل یہود نے کیا اور یہ بلا شبہ حرام اور خالقِ کائنات کے لیے افترا ہے۔

2.اس معنی کے تحت یہ قرآن کی فصاحت و بلاغت پر اعتراض کے مترادف ہے، گویا اللہ تعالیٰ عبارت صحیح بغیر تقدیم و تأخیر ادا نہیں کر سکتے۔ **نعوذ باللہ من غضب اللہ۔**

3.اس تفسیر کے تحت لازم آتا ہے کہ معطوف بر معطوف علیہ ہو، اور جو معطوف ہے وہ لازماً معطوف علیہ کے تابع ہو۔ یہ عمل خصوصاً کلام رب العالمین میں انتہائی ناپسندیدہ اور شنیع تصور کیا جاتا ہے۔

4.مزید یہ کہ تقدیم معطوف بر معطوف علیہ، اگر حرف عطف کے دخول کے ساتھ ہو، تو یہ بھی بالکل شنیع اور قرآن کی تقدس کے خلاف ہے۔

# حضرت عیسیٰ ع کی موت کی طرف اشارہ کرنے والی آیات

﴿ وَإِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ ۖ قَالَ سُبْحَانَكَ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي بِحَقٍّ ۚ إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ. مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴾

یہ آیت بیان کرتی ہے کہ جب خداوند تبارک و تعالی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی روح قبض فرمائی اور انہیں موت کے بعد قبض کیا، تو ان پر نصاری کے اعمال و اقوال، اور ان کے مسیح و مریم کے الہیت کے دعوے پیش کیے گئے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کیا گیا کہ: "ای عیسیٰ! کیا تم نے لوگوں سے کہا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود بنا لیں؟"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اضطراب کے ساتھ رب کی بارگاہ میں عرض کیا:

1. سُبْحَانَکَ مَا یَکُونُ لِي أَنْ أَقُولَ مَا لَیْسَ لِي بِحَقٍّ

"پاک ہے تو! میرے لیے جائز نہیں کہ میں وہ کہوں جو میرے لیے حق نہیں۔"

2. إِن کُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ

"اگر میں نے ایسا کہا بھی ہوتا تو تو اس سے باخبر ہے۔"

3. مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَا أَمَرْتَنِي بِهِ أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ

"میں نے لوگوں سے کچھ نہیں کہا مگر وہی جو تُو نے حکم دیا کہ اللہ کی عبادت کریں، جو میرا اور تمہارا رب ہے۔"

4. وَكُنتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنتَ أَنتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنتَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

"میں نے اس قوم میں جو موجود تھا ان کے اعمال و اقوال پر گواہی دی۔ اور جب تُو نے مجھے قبض فرمایا تو تُو ہی ان پر نگہبان اور گواہ تھا، اور تُو ہر چیز پر گواہ ہے۔"

مفاد تمام جوابوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصاریٰ کی تثلیث کی تعلیم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے الٰہیت کے دعوے جھوٹ اور بے علمی پر مبنی تھے۔

اور اس آیت میں لفظ **توفی** بھی مرگ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ امام بخاری نے اپنی صحیح کتاب اور دو تفسیر کی کتابوں میں یہ حدیث نقل کی ہے:

خَطَبَنا رَسُولُ اللهِ فَقالَ يا أَيُّها النّاسُ إِنَّكُم مَحْشُورُونَ إِلى اللهِ حُفاةً عُراةً غُرلاً ثُمَّ قالَ كَما بَدَأْنا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعداً عَلَيْنا إِنّا كُنّا فاعِلِينَ ثُمَّ قالَ أَلا وَإِنَّ أَوَّلَ الخَلائِقِ يُكْسى يَومَ القِيامَةِ إِبْراهِيمُ أَلا وَإِنَّهُ يُجاءُ بِرِجالٍ مِنْ أُمَّتِي فَيُؤْخَذُ بِهِمْ ذاتَ الشِّمالِ فَأَقُولُ يا رَبِّ أَصْحابِي فَيُقالُ إِنَّكَ لا تَدْرِي ما أَحْدَثُوا بَعْدَكَ فَأَقُولُ كَما قالَ العَبْدُ الصّالِحُ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيداً ما دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ وَأَنْتَ عَلى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ

ترجمہ: رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا:
"اے لوگو! تم سب قیامت کے دن اللہ کے حضور حشر کیے جاؤ گے، پاؤں برہنہ، عریان اور ختنے کے بغیر۔ پھر فرمایا، جیسا ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا ویسا دوبارہ پیدا کریں گے، یہ ہمارا وعدہ ہے اور ہم اسے پورا کریں گے۔ پھر فرمایا کہ پہلے شخص جو اس دن لباس پہنیں گے وہ ابراہیم علیہ السلام ہوں گے۔ پھر اس دن میری امت کے مردان سخت حالت میں پیش کیے جائیں گے، اور میں عرض کروں گا: 'اے میرے رب! میرے صحابہ کو انصاف دے۔' تو کہا جائے گا: 'اے پیغمبر! تم نہیں جانتے کہ انہوں نے تمہارے بعد کیا اعمال کیے۔' پھر میں عرض کروں گا جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: 'میں ہمیشہ ان پر گواہ تھا جب میں ان میں موجود تھا، اور جب تُو نے مجھے قبض فرمایا تو تُو ہی ان پر نگہبان تھا

اگر اس حدیث شریف پر غور کیا جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے **وفات مسیح علیہ السلام کی گواہی کس طرح دی** جب انہوں نے اپنے نفس کے لیے لفظ **فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي** استعمال کیا، جس طرح مسیح علیہ السلام نے استعمال کیا۔ یہ بات بدیہی ہے کہ رسول خدا ﷺ کی وفات واقع ہوئی اور قبر مبارک مدینہ منورہ میں موجود ہے۔

اس بیان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ رسول خدا ﷺ نے اپنی واقعہ اور واقعہ مسیح علیہ السلام کو ایک واقعہ قرار دیا۔ یوں لفظ **تَوَفَّيْتَنِي** کا مفہوم صاف ہو گیا اور ثابت ہوا کہ اس کا مطلب **میراندن (قبض روح کرنا)** ہے، نہ کہ وہ معنی جو بعض لوگوں نے تراش لیے، جیسے رفع جسمانی زندہ یا رجعت۔

اگر اس لفظ کا مطلب یہ ہوتا کہ مسیح علیہ السلام کو جسم عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھا لیا گیا، تو پھر پیغمبر اکرم ﷺ کو بھی اپنے نفس شریف کے ساتھ جسم عنصری میں آسمان پر اٹھنا پڑتا، کیونکہ انہوں نے لفظ **توفیتنی** میں خود کو مسیح کے ساتھ شریک کیا۔

رسول خدا ﷺ نے اس سے بھی اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ فرمایا:

**لَوْ كَانَ مُوسَى وَعِيسَى حَيَّيْنِ مَا وَسِعَهُمَا إِلَّا أَنْ يَتَّبِعَانِي**

یعنی: "اگر موسیٰ اور عیسیٰ زندہ ہوتے، تو ان کے لیے ممکن نہ ہوتا مگر یہ کہ وہ میری پیروی کرتے۔"

یہ حدیث شریف متعدد علماء نے نقل کی ہے، جن میں شامل ہیں:

- ابن قیم، **مدارج السالکین**
- ابو الفداء، اپنی **تفسیر** میں
- شیخ عبدالوھاب شعرانی، **یواقیت و جواھر** میں
- شیخ اکبر محیی الدین، **فتوحات** میں
- شیخ ابن حجر، اپنی تفاسیر میں

# اور وہ آیات جو مسیح کی وفات کی طرف دلالت کرتی ہی

سورۃ النساء (4:157-158)

وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ وَلَٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ ۚ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ ۚ مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا ۚ بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا

اور انہوں نے اسے نہ مارا، اور نہ صلیب پر چڑھایا، بلکہ ان کے لیے اس کا ظاہر مشتبہ بنا دیا گیا۔ اور جو لوگ اس معاملے میں اختلاف کرتے ہیں، وہ اس کے بارے میں شک میں ہیں۔ ان کے پاس اس کا کوئی یقینی علم نہیں، سوائے اس کے کہ وہ صرف گمان کی پیروی کرتے ہیں۔ اور یقیناً انہوں نے اسے نہ مارا۔ بلکہ اللہ نے اسے اپنے پاس بلند کیا، اور اللہ غالب و حکیم ہے۔

اس آیت سے استدلال یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اعلان فرمایا کہ میں وہ مسیح موعود ہوں جو تورات میں ذکر ہوا ہے، تو نصاریٰ نے اس پر ایمان لے لیا، لیکن یہود نے اسے جھٹلایا۔ یہود کی تورات میں یہ تعلیم تھی کہ جو نبی قتل کیا جائے یا جسے دار پر لٹکایا جائے وہ ملعون ہوگا اور اللہ تعالیٰ اسے بلند نہیں فرمائے گا۔ ان کے نزدیک یہ عقیدہ مضبوط تھا کہ ہر مصلوب شخص ملعون اور بلند مرتبہ نہیں ہو سکتا۔

اسی لیے انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب اور ملعونیت ظاہر کرنے، اور روحانی بلندی (رفع) کی روک تھام کے لیے سازش کی اور شرعی مکر استعمال کیا کہ حضرت عیسیٰ کو قتل اور صلیب پر لٹکا دیا جائے تاکہ یہ ظاہر ہو کہ وہ تورات کے مطابق ملعون اور روحانی طور پر بلند نہ ہوئے۔ اس طرح ان کی منطق یہ تھی کہ چونکہ مسیح بن مریم مصلوب ہے، ہر مصلوب ملعون ہے اور خدا کے نزدیک بلند مرتبہ نہیں ہو سکتا، لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی ملعون اور روحانی طور پر بلند نہیں ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ یہ **عقیدہ اور سازش غلط ہے**؛ حضرت عیسیٰ علیہ السلام معاذ اللہ نہ ملعون ہیں اور نہ ہی خدا کے نزدیک روحانی طور پر بلند ہونے سے محروم ہیں۔

خداوند تعالیٰ نے اس مبارک آیت میں یہود کی جانب سے حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں پھیلائے گئے الزام کو رد فرمایا اور ان کے جھوٹ کو بے بنیاد قرار دیا:

**وَمَا قَتَلُوهُ وَمَا صَلَبُوهُ**

یعنی وہ لوگ مسیح علیہ السلام کو نہ قتل کر سکے اور نہ صلیب پر لٹکا سکے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ وعدہ فرمایا تھا:

**أَنِّي مُتَوَفِّيكَ**

"میں تجھے اپنی طرف سے مروا دوں گا"، یعنی موت مسیح کے لیے روحانی قبض تھی، نہ کہ جسمانی قتل یا صلیب۔

وَلٰكِن شُبِّهَ لَهُمْ

یعنی یہ معاملہ ان کی نظر میں مشتبہ ہو گیا، اور وہ اختلاف کرنے لگے؛ کچھ نے کہا کہ ہم نے اسے قتل کیا اور صلیب پر لٹکا دیا، اور کچھ نے کہا کہ ہم نے نہ قتل کیا اور نہ صلیب پر لٹکایا۔

وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِيهِ

جو لوگ مسیح علیہ السلام کے قتل و صلیب کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں

لَفِي شَكٍّ مِّنْهُ

وہ حقیقت میں اس مسئلے میں شک میں ہیں۔

مَا لَهُم بِهِ مِنْ عِلْمٍ إِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ

انہیں مسیح کو قتل کرنے کا حقیقی علم نہیں ہے، صرف ظن اور گمان کی پیروی ہے۔

وَمَا قَتَلُوهُ يَقِينًا

یقیناً انہوں نے مسیح علیہ السلام کو قتل نہیں کیا، تاکہ ان کا مفروضہ کہ ہر مصلوب ملعون ہے اور روحانی بلندی نہیں حاصل کر سکتا، غلط ثابت ہو۔

بَل رَّفَعَهُ اللَّهُ إِلَيْهِ

بلکہ اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کو اپنی طرف اٹھایا اور روحانی بلندی عطا فرمائی، تاکہ اپنے وعدے أَنِّي مُتَوَفِّيكَ کی تکمیل ہو جائے۔

اور جیسا کہ سابقہ دلائل سے واضح ہو چکا ہے، جب فاعلِ رفع خداوند متعال ہو اور مفعول کوئی انسان ہو، تو اس کا مطلب محض روحانی بلندی ہے، نہ کہ جسمانی اٹھانا۔ اور یہود کا یہ دعویٰ کہ عیسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا نہیں گیا، رفعِ جسمانی کے بارے میں نہیں بلکہ رفعِ روحانی کے بارے میں تھا، یعنی کہ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ ملعون نہ ہوں۔ لہٰذا اگر صلب یعنی صلیب پر لٹکانے کا مفہوم، ملعونیت ہے، اور رفعِ روحانی کا مفہوم قربِ خدا ہے، تو یہ دونوں باہم متضاد ہو جاتے ہیں۔ اور جب صلب یعنی ملعونیت ثابت نہیں ہوئی، تو رفعِ روحانی یعنی قربِ خدا کی حقیقت ثابت ہو جاتی ہے، جیسا کہ لفظ بل (بلکہ) کی دلیل یہ ظاہر کرتی ہے کہ سابقہ دعویٰ باطل ہے۔

یہی اصل مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نہ قتل ہونے اور نہ صلیب پر لٹکائے جانے کو بیان فرمایا، اور یہود کی جانب سے لگائے گئے الزامات سے مسیح علیہ السلام کو بری کیا۔ ورنہ قصۂ عدم صلب کو بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ انبیاء کا قتل کسی طرح ان کی شان میں کمی یا نقصان نہیں ہے۔ بہت سے انبیاء کو بھی اللہ کی راہ میں قتل کیا گیا، جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام، حضرت زکریا علیہ السلام، اور دیگر انبیاء۔

## اور وہ آیات جو مسیح کی وفات کی طرف دلالت کرتی ہی

مَّا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ۔

یعنی مسیح بن مریم کوئی الٰہی ذات یا غیر معمولی شخصیت نہیں، بلکہ وہ بھی رسول ہے، جیسے اس سے پہلے کئی رسول گزر چکے ہیں۔ اور اس کی والدہ بھی صدیقہ اور پارسا تھیں۔ یہ دونوں بھی عام انسان کی طرح طعام کھاتے تھے۔

اس آیت مبارکہ کے ذریعے خداوند متعال موت حضرت عیسیٰ کو بطریق استقراء ثابت فرماتا ہے، یعنی وہ جس انسانی عارض و خصوصیات سے انبیاء کو مبتلا کیا گیا، وہ حضرت عیسیٰ پر بھی وارد ہوئی۔ اور موت ان خصوصیات میں سے ایک ہے، اس لیے حضرت عیسیٰ بھی فوت ہوئے، جیسے کہ پہلے کے انبیاء فوت ہو چکے تھے۔

مزید برآں، یہ آیت خداوند کی طرف سے یہ بھی واضح کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ کا الٰہی ہونے یا غیر فانی ہونے کا دعویٰ باطل ہے، اور وہ بھی طعام کھانے والے انسان کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس سے حضرت عیسیٰ کے زندہ ہونے یا جسمانی طور پر آسمان اٹھائے جانے کے دعوے منسوخ اور باطل ثابت ہوتے ہیں۔

اور جو کچھ نصاری نے حضرت عیسیٰ اور مریم کے بارے میں دعویٰ کیا، وہ سب قرآن کے بیان کے مطابق باطل ثابت ہوگا۔( اللہ ہمیں اس سے محفوظ رکھے۔)

## اور وہ آیات جو مسیح کی وفات کی طرف دلالت کرتی ہی

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ۔ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۖ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ۔

یعنی جو لوگ اللہ کے سوا کسی اور کو معبود یا الٰہی ذات سمجھ کر پوجتے ہیں — جیسے کہ نصاری مسیح و مریم اور بعض قومیں عزیر کو — وہ خود کچھ پیدا نہیں کر سکتے، جبکہ وہ خود بھی مخلوق ہیں۔ یہ لوگ مردہ ہیں، زندہ نہیں، اور یہ نہیں جانتے کہ کب دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔

اور یہ آیت اس استدلال کی طرف اشارہ کرتی ہے: اس طرح کہ مسیح، جو نصاری کا معبود ہے "من دون اللہ"، یعنی اللہ کے سوا معبود بنایا گیا ہے، اور ہر معبود مردہ ہے، لہٰذا مسیح بھی مردہ ہے۔

# مسیح کی زندہ رہنے کے لیے آیات پر استدلال غلط ہے

قائلینِ حیاتِ مسیح نے اس آیت پر استدلال کیا ہے اور ہم یہاں آیات ذکر کر کے اس استدلال کی بطلان بیان کرتے ہیں۔

1. آیت:

وَإِن مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ إِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهِ قَبْلَ مَوْتِهِ

ان کے استدلال کی بنیاد یہ تھی کہ مسیح زندہ ہیں۔ اس استدلال کی دو بنیادیں ہیں:

- پہلا: لفظ لَيُؤْمِنَنَّ میں نونِ تاکید ہے جو معنی کو مضبوط بناتی ہے، اور بعض نحویین کے مطابق یہ صرف مستقبل کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
- دوسرا: ضمیر بِهِ اور مَوْتِهِ مسیح بن مریم کی طرف رجوع کرتا ہے، جیسا کہ بخاری نے صحیح حدیث میں ابو ہریرہ سے نقل کیا ہے۔

ترجمہ: "کسی اہلِ کتاب میں ایسا نہیں ہے جو ان (مسیح) پر ایمان نہ لائے اس کی موت سے پہلے۔"

اس سے حاصل شدہ استدلال:

1. لفظ مَوتِہِ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسیح زندہ ہیں۔
2. اہلِ کتاب مستقبل میں مسیح پر ایمان لائیں گے، جس سے مسیح کی حیات ثابت ہوتی ہے۔

لیکن: آیت کے سیاق میں نونِ تاکید اور نفی کے ساتھ یہ دلیل مکمل نہیں بنتی، اور یہاں منظورِ آیت وقتِ نزولِ مسیح ہے، جیسا کہ احادیثِ نزول بھی ظاہر کرتی ہیں۔

مفسرین نے ضمیر بِہِ اور مَوتِہِ کے متعلق اختلاف کیا:

- بعض کے مطابق مَوتِہِ اہلِ کتاب پر رجوع کرتا ہے اور بِہِ خدا کی طرف ہے، یعنی اہلِ کتاب اپنی موت سے پہلے خدا پر ایمان لائیں گے۔
- بعض کے مطابق بِہِ محمد ﷺ کی طرف ہے اور ایمانِ محمد ایمانِ عیسی کی شمولیت کا سبب بنتا ہے۔
- بعض کے مطابق دونوں ضمیر مسیح کی طرف ہیں۔

یہ اختلاف ظاہر کرتا ہے کہ آیت کے معانی متعدد ہیں، اور یہ یقین پر دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ جب احتمال موجود ہو تو استدلال باطل ہے، جیسا کہ کہا گیا:

*اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال*

"جب احتمال پیدا ہو تو استدلال باطل ہے۔"

اب ہم مقدماتِ استدلال پر نظر ڈالیں گے تاکہ صحت و سقم معلوم ہو سکے۔ ہم کہتے ہیں کہ نحو میں مقررہ قاعدہ یہ ہے کہ **نونِ تاکید** صرف مضارع کو **مستقبل** کے معنوں میں محدود کرتی ہے، جیسا کہ بعض استدلال کرنے والوں نے بیان کیا، وہ صحیح نہیں ہے۔

صاف اور واضح قاعدہ یہ ہے کہ:

- جب کوئی مضارع صیغہ جو حال اور مستقبل دونوں کے لیے مشترک ہو، اس کے ساتھ **نونِ تاکید** لگائی جائے تو وہ مستقبل کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے۔
- اگر اس کے ساتھ **لامِ تاکید** ہو تو وہ حال کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔

یہ قاعدہ قدیم، مستمر اور زبانِ عامہ میں بچوں کے لیے بھی جاری ہے اور کتبِ نحو میں بیان ہوا ہے۔

لیکن نحو کی کسی کتاب میں یہ نہیں لکھا کہ:

> مضارع جب مصدّر ہو بغیر لامِ تاکید کے اور نونِ تاکید اس کے ساتھ ہو، تو اس کا معنی مستقبل ہوگا۔

اور جو بھی شخص اس معنی کا دعویٰ کرے، اس پر لازم ہے کہ اسے ثابت کرے۔

تحقیق اور مشاہدہ یہ ہے کہ:

- مضارع مؤکّد بغیر لام اور نون کے استمرار کے لیے ہے، کیونکہ:
  - نونِ تاکید مستقبل کا مطلب دیتی ہے
  - لام حال کا مطلب دیتی ہے

واضح ہے کہ ایک ہی صیغہ ایک ہی مفہوم میں دو متضاد معنی نہیں دے سکتی۔ لہٰذا نون اور لام کو مستقبل و حال کے لیے استعمال کرنا لغو ہو جاتا ہے۔

چونکہ کوئی ترجیح نہیں ہے، اور لغویت سے بچنے کے لیے، اور دلائل کی بنا پر، اس صیغے کا مطلب استمرار ہوگا۔

اس بیان کے بعد واضح ہوگیا کہ آیت لیؤمنن خبر نہیں بلکہ انشائی ہے، یعنی یہ کسی مستقبل واقعے کی اطلاع نہیں دیتی بلکہ حکم یا وعدہ کے انداز میں بیان ہے۔ جیسے کہ بیضاوی، کشاف، ابوسعود اور دیگر مفسرین نے تصریح کی ہے۔ لہٰذا یہ آیت استدلال بر حیات عیسی کے لیے قطعی طور پر قابلِ قبول نہیں ہے۔

اب ضمیر بہ و موتہ کا عیسی بن مریم پر رجوع کرنا، جیسا کہ استدلال میں کہا گیا، صحیح نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگر ہم فرض کریں کہ سب یہود عیسی پر ایمان لائیں گے پیش از موت عیسی، تو یہ لازم آتا ہے کہ بنی اسرائیل تک زمان نزول عیسی زندہ اور سالم رہیں۔ کیونکہ ایمان تمام اہلِ کتاب محصور بحیات عیسی نہیں بلکہ لازم ہے کہ ایمان تمام کفار بنی اسرائیل سے منسلک

ہو، از اوّل زمان تا قیامت۔ اور یہ بدیہیات میں سے ہے کہ بہت سے یہود مردہ اور دفن ہو چکے ہیں اور ایمان عیسی نہیں لائے۔ لہذا یہ کیسے ممکن ہے کہ کہا جائے کہ یہود ایمان لائیں گے **پیش از موت مسیح**؟ واضح ہے کہ یہ معنی باطل ہے۔

اسی وجہ سے، تفسیرِ مظہری کہتا ہے کہ رجوع ضمیر موتہ بہ عیسی ممنوع ہے، اور اس کے لیے کوئی حدیث معتبر موجود نہیں ہے۔ جو قول ابوہریرہ نے بیان کیا وہ محض گمان تھا۔

پس صحیح تاویل یہ ہے کہ کہا جائے کہ ضمیر «بہ» متعلق ہے پچھلے بیان "یعنی مسیح کے قتل اور صلیب پر چڑھائے جانے کا واقعہ سے، اور ضمیر دوم یعنی «موتہ» متعلق ہے اہل کتاب سے، یعنی کوئی بھی اہل کتاب ایسا نہیں ہے مگر یہ کہ اپنے مرنے سے پہلے ایمان لائے۔ قتل و صلب کے سلسلے میں بھی یہی معنی ثابت ہوتا ہے، اور اس کی دلیل ابی بن کعب کی قرأت ہے، جنہوں نے اس آیت کو اس طرح پڑھا:

«وَ إِن مِّنۡ أَهۡلِ الۡكِتَابِ إِلَّا لَيُؤۡمِنَنَّ بِهِ قَبۡلَ مَوۡتِهِمۡ»

سیوطی نے کتاب **اتقان** میں اور ابوعبیدہ نے **فضائل القرآن** میں کہا کہ شاذہ قرأت کا مقصد مشہور قرأت کی وضاحت اور تفسیر کرنا ہے، اور یہ بات تابعین میں ثابت ہے کہ ان کی قرأت مفسر ہوگی، خاص طور پر بزرگان صحابہ کے لیے، خصوصاً اُبیّ، جس کے بارے میں رسول اکرم نے فرمایا:

«أَقْرَؤُكُمْ أُبَيٌّ»

تم میں سب سے زیادہ قرآن پڑھنے والا ابیّ ہے

اور حدیث متفق علیہ بھی ہے:

«قال رسول اللہ ان اللہ امرنی ان اقرء علیک القرآن قال اللہ سمانی لک قال نعم قال و ذکرت عند رب العالمین قال نعم فذرفت عیناہ»

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا کہ میں تم پر قرآن پڑھوں۔ میں نے اللہ سے پوچھا: کیا تم نے مجھے نامزد فرمایا؟ فرمایا: ہاں۔ میں نے کہا: کیا یہ میرے لیے ذکر ہوگا؟ فرمایا: ہاں۔ تو اس وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے۔

## اور وہ آیات جو حیاتِ مسیح کے استدلال کے لیے پیش کی گئی ہیں

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ

خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے: "اور لوگوں سے گہوارے میں اور بلوغت کے وقت بات کرتا ہے اور نیکوں میں سے ہوتا ہے۔"

بعض مفسرین اور قائلین حیاتِ مسیح نے اس آیت کو دلیل کے طور پر پیش کیا کہ مسیح نے گہوارے میں بات کی اور آسمان سے نزول کے بعد بھی وہ عمر رسیدہ ہو کر لوگوں سے بات کرے گا۔

لیکن اگر اس آیت کی لفظی ترکیب اور ظاہری معنی پر توجہ دی جائے، تو یہ کسی بھی طرح اُن کے مطلوبہ استدلال کی تصدیق نہیں کرتی۔ آیت کا مفہوم واضح کرتا ہے کہ مسیح نے بچپن میں گہوارے میں بات کی اور بلوغت کے وقت بھی بات کی، یعنی وہ اس دنیا میں زندہ رہا تاکہ بالغ ہو کر نبوت اور رسالت کی تبلیغ کر سکے۔

اس آیت سے نہ اس کے صعود اور نزول کا ثبوت ملتا ہے اور نہ ہی اس کے بعد تکلم کا۔ تفاسیر اور تاریخوں میں بھی یہ ثابت ہے کہ مسیح زندگی میں بلوغت تک پہنچا اور نبوت کے ذریعہ لوگوں سے بات کی، لیکن آیت میں ان واقعات کی جانب کوئی اشارہ نہیں ہے۔

## اور وہ آیات جو حیاتِ مسیح کے استدلال کے لیے پیش کی گئی ہیں

خدا تعالیٰ کا ارشاد ہے: *وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا*

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں اختلاف کیا ہے:

- بعض نے کہا کہ ضمیر *انہ* قرآن مجید کی طرف رجوع کرتا ہے۔
- بعض نے کہا کہ یہ ضمیر حضور اکرم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کی طرف رجوع کرتا ہے۔
- بعض نے کہا کہ یہ ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف ہے، اور مراد پیدائش بغیر باپ یا آسمان سے نزول ہے۔

جو قائلین حیاتِ مسیح ہیں وہ آخری معنی، یعنی نزولِ آسمان، پر استدلال کرتے ہیں۔

لیکن یہ استدلال بھی مکمل نہیں ہے، کیونکہ آیت کے محتمل معانی مختلف ہیں۔ اہل علم میں مشہور ہے: *اذا جاء الاحتمال بطل الاستدلال* یعنی "جب احتمال پیدا ہو تو استدلال باطل ہو جاتا ہے"۔

علاوہ ازیں، یہ بھی دلیل قطع نہیں ہے کہ ضمیر عیسیٰ کی طرف رجوع کرے اور مراد نزولِ آسمان ہو، کیونکہ یہ آیت مخصوص طور پر تہدید کے بارے میں ہے۔ تہدید اس وقت صحیح ہے جب قیامت کی علامت واقع ہو، لیکن قیامت سے پہلے یہ معنی نہیں رکھتی، کیونکہ منکرینِ قیامت کہیں گے کہ "جب علامت ہی نہیں آئی تو یہ تہدید کیسے صحیح ہو سکتی ہے؟"

سب سے قریب الصواب یہی ہے کہ ضمیر عیسیٰ علیہ السلام کی طرف رجوع کرتا ہے اور مراد یہ ہے کہ وہ بغیر باپ کےپیدا ہوا، جیسا کہ تاریخوں میں ثابت ہے کہ یہود کی صدوقیہ فرقۃ قیامت کے انکار کرنے والے تھے۔ لہٰذا ان کے شک کو دور کرنے کے لیے فرمایا:

وَإِنَّهُ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا

اور دلیل اس کی یہ آیت ہے:

وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ

سب سے صحیح یہی ہے کہ ضمیر قرآن کی طرف رجوع کرتا ہے، کیونکہ قرآن قیامت کی آیات کو سب سے واضح طریقوں سےبیان کرتا ہے، تاکہ کسی کو ان میں شک نہ رہے۔

وَصَلَّى اللَّهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَآلِهِ الطَّاهِرِينَ